مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ ہوگا ـــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۵۳ ویں جلد

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۴ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۳

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۴ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

Accession No. 30772
Class No. معارف
Book No. 125

جلد ۱۵۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جمہوریت کو موجودہ دور کا سب سے مقبول اور پسندیدہ طرزِ حکومت سمجھا جاتا ہے، ہندوستان میں بھی آزادی کے بعد یہی طرزِ حکومت رائج ہوا مگر رفتہ رفتہ یہاں اس کی بڑی مضحکہ خیز اور بدنما صورت سامنے آنے لگی ہے جس کا مشاہدہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، اس سے جہاں ملک کی تصویر بگڑتی جا رہی ہے وہاں ہر شعبۂ زندگی میں تنزل و انحطاط تیزی سے شروع ہو گیا ہے، اخلاقی پستی اور معاشی خرابی روز بروز بڑھ رہی ہے، معمولی دفتروں سے لیکر ایوانِ بالا تک لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم ہے، تعلیم گاہوں اور عدالتوں میں بھی رشوت، بدعنوانی، ناانصافی، دھاندلی، کنبہ پروری، فرض ناشناسی اور کام نہ کرنے کا رجحان وبائی بیماریوں کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ جمہوریت نے لوگوں کو آزاد، بے لگام اور غیر مکلف بنا دیا ہے، نہ کسی پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ پابندی، ہر چیز کی چھوٹ مل گئی ہے، جس کام پر آدمی مامور ہے اسے انجام دینا اس کی مرضی پر منحصر ہے اس کے لیے نہ اسے مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کوئی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے لیکن خود اسے ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں جس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہونی چاہیے اگر اس پر کسی طرح کی قدغن لگائی جاتی ہے تو وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے ہر قسم کے طریقے اختیار کرتا ہے، ہڑتال، دھرنا اور مرن برت سے لیکر تشدد اور خون ریزی تک پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ دفتروں میں نہ خاطر خواہ طور سے کام ہو رہا ہے اور نہ کام نہ کرنے پر کوئی بازپرس ہوتی ہے، معمولی معمولی کاموں کیلئے عام آدمیوں کو سینکڑوں بار چکر لگانا پڑتا ہے، خوشامد، سفارش اور رشوت کے بعد بھی کام ہو جائے تو بڑی بات ہے، قانون و قاعدہ اور عدل و انصاف کی بالادستی ختم ہو گئی ہے۔

تعلیم پر قوموں کی فلاح و ترقی اور افراد کی سیرت و کردار سازی کا دار و مدار ہوتا ہے اور تعلیم گاہیں ہی وہ کارخانے ہیں جہاں سے لائق اور مناسب اشخاص ڈھل کر نکلتے ہیں مگر ان کا جو ابتر حال ہے اس میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے اشخاص مہیا کر سکتی ہیں جن کی ذہنی و دماغی قابلیت سے قوم و ملک کا کچھ بھلا ہو سکتا ہے، تعلیم کو ایک کاروبار بنا لیا گیا ہے اور عام کاروباری معاملات ہی جیسے اس کے بھی معیار وضع کر لیے گئے ہیں جن کے لیے فنِ تعلیم سے مناسبت اور قابلیت و استعداد کی کوئی شرط نہیں رہ گئی ہے بس ڈگری ہونی چاہیے خواہ وہ کسی طرح سے بھی حاصل کی گئی ہو، اسی لیے اساتذہ اور کالجوں اور اسکولوں کا نظام چلانے والوں کو تعلیم و تربیت کے اصلی مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، رہی سہی کسر محکمۂ تعلیم اور اس سے وابستہ لوگ پوری کر دیتے ہیں جن کی کارستانی مزید دردانگیز ہے، ایسی صورت میں ع چہ کار طفلاں تمام خواہد شد۔

چنانچہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ طلبہ کی دلچسپی کے میدان کچھ اور ہی ہو گئے ہیں، وہ امتحان میں نقل کو اپنا حق تصور کرتے ہیں جس کے نہ ملنے پر وہ ہر آفت ڈھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

بیاباں کی اس شبِ تاریک میں اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود دینی مدارس قندیلِ رہبانی بن کر ملک کے گوشے گوشے کو جگمگا رہے تھے، ان کے اخلاص، ایثار اور قناعت پسند طلبہ، اساتذہ اور منتظمین اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی تکمیل میں حسبۃً للہ مصروف تھے، یہ لوگ نہ کسی مراعات کے خواستگار ہوتے تھے اور نہ اپنے حقوق و مطالبات کو منوانے کے لیے ہنگامے اور شورشیں برپا کرتے تھے، الحمد للہ بعض بعض مدارس میں جو حکومت کی امداد و سرپرستی کے بغیر مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہے ہیں یہ ماحول اور فضا ابھی تک برقرار ہے اور وہاں لوگ تعلیم و تعلم کے مشغلے میں یکسوئی کے ساتھ منہمک ہیں، لیکن جن مدارس کی نگاہیں حکومت کے سیم و زر کی طرف اٹھیں اور وہ اس کا سبز باغ دیکھ کر للچا اٹھے ان کا حال جدید تعلیم گاہوں جیسا ہو گیا ہے، اخلاص، برکت اور روحانیت غائب ہوتی جا رہی ہے، نظم و ضبط کا حال بدتر ہو رہا ہے، نہ طلبہ کو پڑھنے سے غرض اور نہ اساتذہ کو پڑھانے سے واسطہ، سب ایک گومگو میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے ہی ہاتھوں مدارس کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں، موجودہ ہوشربا گرانی میں جس پر قابو پانے میں حکومت بالکل ناکام ہو گئی ہے اچھی اور معقول تنخواہوں کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے لیکن کیا حکومت کی دریوزہ گری کے بعد مدارس کی خصوصیات و امتیازات باقی رہ سکتے ہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد کو شر پسندوں نے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی ملی بھگت سے ڈھا دیا، اب دوسری مساجد کی تباہی و بربادی کے لیے بھی حکومت نے دام ہم رنگ زمین بچھایا ہے، ائمہ مساجد کی تنظیم اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس کو پردھان منتری کا آشیرواد حاصل ہے، وہ مسجدوں کے ائمہ اور مؤذنوں کی خستہ حالی سے بہت "دکھی" ہیں اس لیے ان کی تنخواہوں کی ادائی کا بوجھ محکمۂ اوقاف اور حکومت کا خزانۂ عامرہ برداشت کرے گا، جو حکومت بابری مسجد اور مسلمانوں کے جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکی اور جس کا رویہ مسلمانوں کے معاملے میں ہمیشہ دوہرا رہا ہے اور جس نے انہیں دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے آخر وہ ائمہ مساجد پر کیوں اس قدر مہربان ہو گئی ہے، اس راز کو بھلا یہ دو رکعت کے امام کیا

سمجھیں گے اور انہیں یہ صدائے غیبی کس طرح سنائی دے سکتی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ تو فقہا اور مفتیانِ کرام ہی بتائیں گے کہ اذان و امامت کی اجرت جائز ہے یا ناجائز ، لیکن چند سکوں اور معمولی فائدوں کے لیے مساجد کی تباہی و بربادی کا آلۂ کار بن جانا کس قدر شرمناک ہے۔ اگر ائمہ میں غیرتِ ایمانی کی کوئی چنگاری باقی ہے تو انہیں دانہ و دام لے کر آنے والے صیادوں سے صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے کہ

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہہ — کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اترپردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو نے دہلی میں آل انڈیا سیکولر فرنٹ کے استقبالیہ جلسہ میں بتایا کہ ان کی حکومت نے اردو کو یو۔ پی میں دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے کچھ اقدامات کیے ہیں، وزیر اعلیٰ کا اردو کے ان حامیوں کا مذاق اڑانا بجا ہے جو اردو کی وکالت انگریزی میں کرتے ہیں، ابھی تک کم و بیش تمام حکومتوں کا رویہ اردو کے ساتھ معاندانہ رہا ہے، کمزور اور مظلوم طبقوں کے حامی وزیر اعلیٰ ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی تلافی کریں گے، دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے سے اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی، یہ اس کی موت کا پیش خیمہ ہے، جو لوگ اس طرح کے شوشے چھوڑتے ہیں ان کا مقصد اردو کے مسئلے کو الجھانا ہوتا ہے، وزیر اعلیٰ کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیے، اردو والے اردو کو اس کی شناخت اور امتیاز کے ساتھ باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

ماہر علم الانسان ڈاکٹر خلیل عباس صدیقی (کلکتہ) ، علامہ شبلی توسیعی خطبات کے سلسلے میں دارالمصنفین تشریف لائے اور ۲۶ دسمبر کو "ہندو مسلم تعلقات" کے موضوع پر اپنا عالمانہ خطبہ دیا جس میں شہر کے معزز ہندو و مسلمان شریک ہوئے اور خطبہ بہت پسند کیا گیا۔

مقالات

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ

کچھ خیالات، کچھ تاثرات

از ضیاء الحسن فاروقی

۳؍ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈیننس کے تحت مولانا آزاد کو حدودِ بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے رانچی (بہار) کا انتخاب کیا کہ دہلی، پنجاب، یو۔ پی اور مدراس میں پہلے ہی سے انکا داخلہ ممنوع تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ کلکتے سے قریب ہونے کی وجہ سے رانچی میں رہ کر شاید وہ تصنیف و تالیف اور البلاغ کی طباعت کا کام جاری رکھ سکیں لیکن جولائی کے اوائل میں رانچی میں انکی نظربندی کے احکامات جاری ہو گئے اور پھر باہر کی دنیا سے انکا تعلق ختم ہو گیا۔ اب بس نظربندی کی تنہائی میں ان کی دل و دماغ کی دنیا آزاد تھی، اس نے ہار نہیں مانی۔ بعد میں ترجمان القرآن کے طبع اول کے دیباچے میں انھوں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا، یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ نظربندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی، میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا کہ اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج

محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔
میں اسی عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں۔"[1]

تذکرہ کی تصنیف

ابھی مولانا آزاد کے قیام رانچی پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انکے ایک دوست فضل الدین احمد نے وہاں پہونچ کر انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی خود نوشت لکھیں اور یہ کہ وہ جلد از جلد اسے مرتب کر دیں۔ مولانا نے عہد اکبری کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلویؒ کے احوال سے جو ان کے ننھیالی بزرگ تھے اس کا آغاز کیا، لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے بعض اکابر اسلام کی دعوت و عزیمت کے کارناموں کے بیان تک دراز ہو گیا جو انجام کار حق و صداقت کی راہ میں علمائے حق کے دعوتی موقف، مجاہدانہ سعی و عمل اور جذبۂ ایثار و قربانی کے اظہار کی ایک موثر اور دلآویز داستان بن گئی۔ اسی کا نام تذکرہ ہے فضل الدین احمد نے اس کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ تذکرہ کس طرح لکھا گیا اور کن حالات میں شایع ہوا اس کے مصنف کو اس پر نظر ثانی کا موقع نہیں دیا گیا اور اسے اخباروں سے پتہ چلا کہ تذکرہ چھپ گیا ہے فضل الدین احمد کو معلوم تھا کہ اگر کتاب کا مسودہ نظر ثانی کے لیے مصنف کو دیا گیا تو پھر شاید کبھی اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئے۔

تذکرہ جس شکل میں چھپا، مولانا آزاد اس سے خوش اور مطمئن نہ تھے فضیلت علمی سے متعلق ان کا ایک معیار تھا، یقیناً وہ چاہتے ہوں گے کہ وہ چھپنے سے پہلے مسودہ کو عالمانہ طرز پہ ایڈٹ کریں اور حسب ضرورت اس کے بعض ٹکڑوں کو از سر نو لکھیں،

۱؎ مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، جلد اول، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۹
۲؎ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱۔

اس کے حوالوں اور حاشیوں پر احتیاط کی نظر ڈالیں اور حاشیوں میں جہاں جہاں اختصار کی ضرورت ہے وہاں عبارتوں کو مختصر کر دیں۔ انہیں تو اس کا بھی موقع نہیں ملا کہ فضل الدین کے مقدمہ میں ہی کچھ ترمیم و تنسیخ کر سکیں، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا: "دراصل اس تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں"[1]

رانچی میں اگرچہ ان کا تعلق رانچی کے باہر کی دنیا سے ختم سا ہو چکا تھا، مولانا کی مصروفیتیں خاصی تھیں، تذکرہ لکھنے کے دوران ہی انھوں نے سیرت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ قلم بند کی جس میں متوسط تقطیع کے ایک سو تہتر [۱۷۳] صفحات تھے اور حدیث بدء الاسلام غریباً و سیعود کما بدء کی تشریح و توضیح شرح حدیث غربت کے نام سے لکھی جس میں سو [۱۰۰] صفحے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ کتابیں چھپ نہ سکیں اور تذکرہ کے بقیہ مسودات کی طرح ان کے مسودے بھی ضایع ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ترجمان القرآن پر اپنی پوری توجہ کی، لیکن اس کی تسوید کی داستان خاصی المناک ہے کہ مولانا کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور حکومت وقت کی دار و گیر کے سبب اسے بھی ایک دور انتشار و آلام سے گزرنا پڑا تب کہیں جا کر ۱۹۳۱ء میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد بشمول تفسیر سورۂ فاتحہ جو ان کا شاہکار ہے، شایع ہو سکی[2]

رانچی کے شب و روز

رانچی میں علمی سرگرمیوں کے علاوہ مولانا آزاد مقامی جامع مسجد میں جمعہ کے دن مسلمانوں کو خطاب بھی کرتے تھے اور آسان زبان میں انہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سمجھاتے تھے اور ہمیشہ اس بات کو ضرور کہتے تھے مسلمانوں کو پورے

۱؎ مولانا آزاد کا خط، معارف (اعظم گڈھ) جلد ۷۲، شمارہ نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۸۹
۲؎ ترجمان القرآن (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن) ج ۱، مولانا آزاد کا مقدمہ۔

طور پر اپنے وجود کی تمام توانائی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونا چاہیے جس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی مکمل اور غیر مشروط فرمانبرداری اور بندگی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی فرمانروائی کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ رانچی سے متصل مورآبادی گاؤں میں جہاں وہ رہتے تھے ان کی کوششوں سے ایک مسجد کی تعمیر عمل میں آئی اور رانچی میں ایک مدرسہ اور ایک ادارہ انجمن اسلامیہ کے نام سے قائم ہوا جس کا مقصد مقامی مسلمانوں کی تنظیم اور اشاعتِ اسلام تھی۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ رانچی تشریف لے گئے تھے، وہاں سے آنے کے بعد یکم اپریل ۱۹۱۹ء کو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو مندرجۂ ذیل خط لکھا جو کئی لحاظ سے مولانا آزاد کے سوانح نگاروں کے لیے اہم ہے:

"اعظم گڑھ

یکم اپریل ۱۹۱۹ء

مکرم، السلام علیکم

والا نامہ ملا۔ ایک عشرہ اپنے مرکز سے غائب رہا، رانچی پہونچا، تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی، بڑے تپاک سے ملے، بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں، وہ تطبیق معقول ومنقول کے دیرینہ ذائقہ سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ وعقائد میں ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔ رانچی کی شور وسنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوئے بیان سے پانی ہوگئی ہے، وہ بھی میٹھا۔ مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے، لوگ بہت مانتے ہیں..."[1]

---

[1] عبدالماجد دریابادی، مکتوبِ سلیمانی، ج۲، ص ۱۶ - ۱۱۵۔

تذکرہ کا موضوع ومقصد

تذکرہ تاریخ اسلام کی ان بعض نامور شخصیتوں کے موضوعاتی سوانحی واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہے جنھیں مولانا آزاد اپنا ہیرو تصور کرتے تھے۔ اسمیں تسلسل نئے شروع سے آخر تک عمل وعزیمت کا ایک پیغام بھی ہے، اگرچہ وہ انتہائے عجز وانکساری میں جو یقیناً ان کی شخصیت کے پیش نظر ایک شاذ اور غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے، اسے محض ایسے "اوراق پریشاں" سے تعبیر کرتے ہیں جو "اپنی پریشانی طبع وبرہمی خاطر کی یادگار ہیں"[1]

ہندوستان کے شیخ جمال الدین، سید محمد جونپوری (۱۴۴۳-۱۵۰۴) اور انکے عقیدتمند اور پُرجوش متبعین، شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴-۱۶۲۴) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲) اور ہندوستان سے باہر کے امام احمد ابن حنبل (۸۵۵-۷۸۰) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ (۱۲۶۸-۱۳۲۸)[2] کی داستان حیات باطل کے خلاف اثباتِ حق کے لیے مسلسل جد وجہد کے کارناموں سے معمور ہے، تذکرہ کا موضوع یہی کارنامے ہیں جو اصلاح وتجدید اور فکر وعمل کی پُرجوش دعوت وعزیمت سے عبارت ہیں۔

مولانا آزاد محض حسب ونسب کی بنیاد پر کسی افتخار وعظمت کے قائل نہ تھے اور کہتے تھے کہ "انسان کے لیے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل، ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں"[3]

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد "تذکرہ" (مرتبہ مالک رام) ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۳۸۹ [2] یہ چند مثالیں ہیں انکے علاوہ اس سلسلے کی اور بھی شخصیتیں ہیں جو تذکرہ میں مذکور ہیں [3] تذکرہ، ص ۲۶۔

ابھی اوپر جن بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسا لگتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے آپ کو ان ہی علمار حق کے سلسلہ کی ایک کڑی تصور کرتے ہیں، اس لحاظ سے دیکھئے تو تذکرہ دراصل اظہارِ ذات کی ایک کہانی ہے جس میں مذکور اکابرینِ فکر و عمل ایک رمز و علامت کی حیثیت رکھتے ہیں' مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ان کی پوری زندگی تصدیق حق اور اثبات صداقت کے اسی رمز کی ایک عملی تفسیر ہے اور آیندہ بھی یہی ان کی راہ عزیمت ہوگی۔

تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اصلاح حال کا جذبہ پیدا ہو اور انہیں اخلاقی انحطاط کی دلدل سے نکالا جائے، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ظلم و تعدی کے خلاف مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے تاکہ سیاسی و سماجی اداروں پر قابض اربابِ اقتدار کی ناانصافیوں کا متحد ہو کر مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ ایک طرح کا اصلاحی کام تھا، اس لیے تذکرہ کے انداز نگارش اور طرز استدلال کو کسی قدر جذباتی ہونا ہی تھا' اس میں یہ جو بعض افراد اور گروہی تعصب کے حامیوں سے متعلق تنقید کا لہجہ خاصا سخت و تلخ ملتا ہے' اس کا سبب بھی وہی تذکرہ کے مقاصد کی اصلاحی و دعوتی نوعیت ہے، لیکن اس کے باوجود کہیں بھی مولانا نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے جو غیر معقول ہو۔

تذکرہ' الہلال اور البلاغ

تذکرہ اپنے بنیادی پیغام کے لحاظ سے الہلال اور البلاغ کے اسی مشن کا تسلسل تھا جس کی اشاعت وہ اپنے ان اخبارات کے ذریعہ پہلے ہی سے کر رہے تھے۔ الہلال اور البلاغ میں انھوں نے مذہبی اور سیاسی امور میں طبقۂ علمار اور جدید تعلیم یافتہ جماعت' دونوں کے یک رُخے' تنگ نظر اور متعصب عناصر کی انتہاپسندیوں کو اپنی تنقید و ملامت کا ہدف بنایا تھا اور مسلمانوں پر یہ واضح کیا تھا کہ اچھی باوقار زندگی کے لیے اسلام کے نزدیک حقوق انسانی اور شرفِ آزادی کتنی مہتم بالشان

30772 معارف 125

اہمیت کے حامل ہیں۔ عہد اکبری کے مذہبی تنازعوں سے متعلق ایک پُر درد لہجے میں بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ ان بے بنیاد جھگڑوں کا اصل سبب افراط و تفریط کا وہ انتہاپسندانہ رویہ تھا جن میں ایک طرف متعصب اور تنگ نظر علمار تھے جنھیں انھوں نے "علمائے سُوء اور بندگانِ دنیا"[1] کہا ہے اور دوسری طرف وہ "مدعیان تحقیق جدید و اجتہاد فکر" تھے جنھیں انھوں نے "حکمت و دانشمندی اور مذہب عقلی اور طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی"[2] کا مبلغ لکھا ہے اور پھر اس صورتِ حال کے آئینہ میں اپنے زمانہ کے حالات پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے۔ مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہواپرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی و تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے' نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ انکی راہ دوسری ہے:

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم"

عہد اکبری میں بھی اربابِ حق و صفا کا جو گروہ تھا، وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چونکہ دربار شاہی پر بدبختانہ یکے بعد دیگرے انہیں دو گروہوں کا تسلط رہا، اسلیے ان کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ جمال الدین بھی

---

[1] تذکرہ ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۴۰۔

ان ہی لوگوں میں سے تھے۔[1]

مولانا آزاد، محضر اکبری اور سید محمد جونپوری

مولانا آزاد کو اس بات پر فخر تھا کہ کبھی ان کے ماں کے خاندان میں شیخ جمال الدین جیسی عظیم شخصیت تھی جنھوں نے ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک کے تیار کیے ہوئے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے یہ محضر بجنسہٖ منتخب التواریخ (جلد دوم، کلکتہ ۱۸۶۵ء صفحات ۲۷۱-۲۷۲) میں نقل کیا ہے۔[2] شیخ موصوف کو اپنے لفظ انکار کے سبب بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا یہانتک کہ ان کے لیے ہندوستان میں رہنا دشوار ہو گیا۔ دوسرا بہانہ شیخ جمال الدین کو ستانے کا علمائے دنیا پرست کو یہ ملا کہ وہ سید محمد جونپوری سے متعلق شیخ موصوف کی اس بات کو لے اڑے کہ "سید محمد جونپوری کی ولایت حق ہے"۔ حالانکہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "لیکن ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے"۔ غرض جب معاندوں نے ہندوستان میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، تو وہ مکۂ معظمہ چلے گئے اور وہاں سے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کے سخت اصرار پر جسے شیخ موصوف سے نہایت درجہ حسنِ اعتقاد تھا، کوئی تیرہ برس بعد ہندوستان واپس آئے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور دہلی پہونچنے کے چند ماہ بعد انتقال کر گئے۔[3]

---

[1] تذکرہ، ص ۱۴۱۔۱۴۰۔ [2] مالک رام صاحب نے تذکرہ (ص ۳۵۶) میں محضر پر جو حاشیہ لکھا ہے، اس میں ان سے ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ لکھتے ہیں: "اس صورت میں سلطان اگر اپنی صوابدید سے کوئی حکم دے، جو بظاہر کسی نص کے خلاف ہو جب بھی اس پر عمل لازم ہوگا..."۔ لیکن محضر میں جو عبارت ہے اس کا مفہوم ہے کہ سلطان عادل اگر اپنے طور پر کوئی حکم صادر کرے جو کسی نص کے خلاف نہ ہو تو وہ حکم بھی واجب الاطاعت ہوگا۔ [3] تذکرہ، ص ۳۵-۳۴۔

ان دونوں مسئلوں سے جن کے باعث شیخ جمال الدین کو صعوبتیں اٹھانی پڑیں، مولانا آزاد کو خاص دلچسپی ہو گئی، شاید اس لیے کہ خود ان کے وطن میں کبھی ان مسائل کی وجہ سے بڑے بڑے معرکہ ہائے دار و رسن برپا ہو چکے تھے اور ان کے اپنے زمانے میں بھی علماء اور مورخین کے حلقوں میں ان سے متعلق پرجوش بحث و نظر کی گرم بازاری تھی (اور اب بھی ہے)۔ غالباً اسی لیے مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں مسئلوں پر (اپنے خیال میں) ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کریں۔ پہلے معاملہ سے متعلق انھوں نے لکھا:

"اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحابِ شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اسی کے سد باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا) کہ پادشاہ کی امامت و اجتہاد، بے قیدی اور الحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی۔ اس لیے ضرور تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں تامل ہو۔"[1]

مولانا آزاد کا خیال ہے کہ سید محمد جونپوری کے اس دعوے کو کہ وہ مہدی ہیں، کسی طرح غیر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یافتہ، اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے کسی روحانی تجربے کا اظہار یہ کہہ کر کیا ہو کہ وہ 'مہدی ہیں' اور ان کے عقیدتمند پیرؤں نے ان کے 'مہدی آخر الزماں' ہونے کا اعلان کر دیا ہو۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "اکثر اہل اللہ اور علمائے حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری ... سے حسن ظن رکھتے تھے یا اقلاً ان کے بارے میں توقف و سکوت سے کام لیتے تھے"۔[2]

---

[1] تذکرہ، ص ۱۴۱ [2] ایضاً ص ۶۰۔

اور اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ داؤد جھنی وال (۷۵/۱۵۷۴-۱۴۰۶) شیخ جمال الدین شیخ وجیہ الدین گجراتی (۱۵۸۹-۱۵۰۵) شیخ علی متقی (۱۵۶۷-۸۱/۱۴۸۰) شیخ بڈھ[1] دانا پوری اور شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲-۱۷۰۳) جیسے اکابر علم و تقویٰ کا نام لیا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزرے ہوں کہ وہ خود اپنے روحانی تجربے سے متعلق دھوکے میں پڑ گئے۔ "ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی وہ یقیناً ایک مہدی ہی کے ظہور کی مقتضی و منتظر تھی نہ کہ ایک مضل و دجال کی"[2] ان کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ سید محمد جونپوری کو ایک غلط فہمی یہ ہوئی ہو کہ لفظ 'مہدی' کو انھوں نے 'مہدی آخر الزماں' سمجھ لیا کہ درحقیقت انتظار اسی مہدی کا ہے اور عام شہرت بھی اسی کی ہے۔ پھر بھی یہ رائے اس صورت میں ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ انھوں نے 'مہدی آخر الزماں' ہونے ہی کا دعویٰ کیا تھا اور یہ بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا، البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے معتقدوں اور مریدوں کی خاصی بڑی تعداد نے اس وقت یہی سمجھا اور اس بات کو خوب شہرت بھی دی۔

مالک رام صاحب کی قیاس آرائی مالک رام صاحب ایک اچھے محقق ہیں' غالبیات اور ابوالکلامیات میں ان کی تحقیقات نہایت وقیع ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے تدوین و ترتیب کا ایک شاندار معیار قائم کیا ہے، لیکن کبھی کبھی ان کا چونکا دینے والی بات کہنے کا شوق' خود ان کے معیار تحقیق کو مجروح کر دیتا ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر کے تذکرہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: "تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان

[1] انکی تاریخ پیدائش و وفات نہ معلوم ہو سکی۔ شیر شاہ سوری کے معاصر تھے جو اپنے قیام بہار کے زمانے میں انکی جوتیاں سامنے لا کر رکھتا تھا۔ [2] تذکرہ، ص ۶۱ (حاشیہ)

(مولانا) کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے۔"[1] یہ خیال کیا تھا؟ مالک رام صاحب اسے مبہم ہی رکھتے ہیں' لیکن مولانا آزاد کا ایک بے درد سوانح نگار اس ابہام کو لے اڑا اور آزاد پر کھل کر یہ الزام عائد کر دیا:

"اگرچہ آزاد اب اپنے متعلق حزب اللہ کے قائد کی حیثیت سے کچھ نہیں لکھ رہے تھے لیکن واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلیفۂ وقت یا مہدی یا اسی قبیل کی کوئی چیز منوانے کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"[2]

مالک رام صاحب کا مذکورہ بیان تذکرہ کے دو ٹکڑوں پر مبنی ہے' جن سے ہمارے نزدیک کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے ذہن میں راسخ العقیدگی کے منافی کسی قسم کا کوئی خیال پرورش پا رہا تھا۔ بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے بزرگ شیخ جمال الدین (معروف بہ بہلول دہلوی) کے علم حدیث سے گہرے شغف' تقدس و تقویٰ اور بلندی و آزادیٔ کردار کا ذکر کیا ہے۔[3] اسے پڑھ کر آزاد کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر ہوا اور اسے بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرور قلب و کیف دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للہ علم حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے اور بزرگ محدثین 'ذوق سنت اور با اہل دنیا کارے نہ داشتن' کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینان فقر و نامرادی[4]

[1] تذکرہ، پیش لفظ، ص ۱۱ [2] آئی۔ ایچ۔ ڈگلس: ابوالکلام آزاد (انگریزی)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۶ [3] بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳ [4] واوین میں جو دو فقرے ہیں' وہ شیخ جمال الدین کے متعلق بدایونی کے ہیں۔

کے حصے میں آئی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہونچے اور یہ سرمستیِ پارینہ دارو ئے تازہ سے ترکیب پاکر ہنگامۂ گزشتہ اور شورش رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکو بیوں کا عالم پھر از سرِ نو تازہ کر دے:

به بدمستی سزد، گر متهم سازد مرا ساقی
هنوز از بادهٔ پارینه ام پیمانه بو دارد"[1]

ایک ٹکڑا تو یہ ہے جسے مالک رام صاحب نے نقل کیا ہے اور دوسرا وہ جو تذکرہ میں اس مقام سے لیا گیا ہے جہاں رانچی کی نظربندی کے پہلے ہی مہینے میں جو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، "عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں" کا ذکر ہے، جہاں تصنیف و تالیف کی مشغولیتوں کا بیان ہے کہ "تمام تر کتاب عزیز و سنت مطہرہ کی شرح و تفسیر پر مشتمل ہیں"۔ جہاں چند مہینوں کے اندر ہی نئے دروازوں کے کھلنے اور کتنے ہی پچھلے فیصلوں کے معطل ہونے کی صدا آتی ہے اور جہاں وہ اپنا یہ احساس قلم بند کرتے ہیں کہ عاشقی جسے ہم کمالِ ہنر تصور کرتے تھے وہ بھی اپنی غفلتوں کے سبب ننگ و عار ثابت ہوئی۔[2] اب وہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے جسے پڑھ کر مالک رام صاحب کو معاً خیال آیا کہ "وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں"۔[3] مولانا لکھتے ہیں:

"زمانے کو کل تک جہاں تک چاہا تھا، الحمدللہ اب خود اس سے بھی منزلوں آگے بڑھ چکے ہیں اور گو ہمراہانِ راہ اب تک اسی منزل میں کمریں کھولے بے فکر

[1] تذکرہ، ص ۳۰۲ [2] ایضاً ص ۳۳۵۔۳۳۳ [3] ایضاً، پیش لفظ، ص ۱۲۔

پڑے ہیں، مگر اپنا کاروانِ طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے:

مئے کہ می رود امروز در گلوئے دو کون[1]
کمینہ جرعۂ تہ شیشہ ہائے دوشِ من است"

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا دونوں ٹکڑوں میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کی بنا پر کسی کو یہ مغالطہ ہو کہ مولانا آزاد ۱۹۱۶ء میں رانچی میں کوئی "خاص دعویٰ" کرنے کے مرحلے پر پہونچ چکے تھے۔ مالک رام صاحب اپنی اس بے بنیاد قیاس آرائی کے لیے پہلے حزب اللہ اور پھر ۱۹۲۰ء میں مسئلہ امامت کا ذکر کرتے ہیں۔[2] حالانکہ حزب اللہ اور مسئلہ امامت، دونوں سے متعلق اردو اور انگریزی میں خاصا مواد فراہم ہو چکا ہے، ان میں کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو مذہب میں راسخ العقیدگی اور سیاست و معیشت میں تنظیم، اصلاح اور آزادی کے رائج الوقت تقاضوں کے منافی ہو۔

مولانا آزاد کی راہ، اعتدال و توازن کی راہ

مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل میں مولانا آزاد نقطۂ نظر و انتہا پسندیوں کے درمیان اعتدال و توازن کی راہ کو پسند کرتے تھے، اس سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ انہیں اصول و کلیات کے معاملہ میں کوئی کسی سمجھوتہ پر آمادہ کر سکتا تھا۔ آزاد کی طبیعت کی یہ افتاد تذکرہ کے درجِ ذیل اقتباس سے آشکارا ہے۔ اعلام الموقعین عن رب العالمین (جلد ۳، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ، ص ۲۲۰) ابن قیم (۱۲۹۲۔۱۳۵۰) کی ایک عبارت کی تشریح اور عقائد و احکام و نصوص سے

[1] تذکرہ، ص ۳۳۵ [2] ایضاً ص ۱۲۔

متعلق کتاب وسنت کی مرکزی حیثیت سے تصدیق وتوثیق کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"... یعنی صحیح راہِ حق واعتدال کہ یہ ہے کہ دو اصل ہیں اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب وسنت ونصوصِ شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیے اور اسی پر حکم وعمل کرنا چاہیے' دوسری یہ کہ تمام ائمۂ اسلام اور علمائے حق سے حسنِ ظن اور محبت وارادت رکھنی چاہیے اور ان کے مراتب وحقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن وتناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ ان ہی میں افراط وتفریط کی ہے.... اور دنیا میں جس وقت سے نوعِ انسانی آباد ہوئی ہے، ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے:

ناہید بغمزہ کشت ومریخ بقہر

لیکن اہلِ حق کی صراطِ مستقیم ان دونوں سے الگ ہے:

میانِ کعبہ وبت خانہ راہیست[1]

اور آزاد کا یہ طرزِ فکر اور ان کی افتادِ طبع کا یہ اظہار کوئی تذکرہ ہی تک محدود نہیں' اس سے پہلے الہلال اور البلاغ میں بھی ہمیں یہی بات ملتی ہے' عمر اور تجربے کے ساتھ ان کے اس موقف اور طریقِ فکر میں اور بھی پختگی آئی اور ان کی زندگی ان کے کردار کے اس وصف کی آئینہ دار بن گئی۔

[1] تذکرہ، ص ۵۶-۵۴۔

تذکرہ اور ترجمان القرآن

یقیناً نصوص کتاب وسنت کے سوا کوئی چیز حق وباطل کا معیار اور حجت وبرہان نہیں ہوسکتی لیکن مولانا نے علماء کو توجہ دلائی کہ کتاب وسنت کو ان کی حقیقی روح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ یہ کہ ہم انھیں فقہی ضابطوں کے بے لچک فریم ورک میں بٹھانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ علماء اپنی روایتی دانشوری کو خیرباد کہہ کر تقلید کی بے جا پاسداری کی تنگ نائے سے نکلیں اور تعلیماتِ قرآنی کی آفاقی اور دائمی حقیقتوں کی نورانی فضا سے ذہن انسانی کو منور کریں۔ ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن کا یہی پیغام ہے جس کی چمک سے تذکرہ کے بعض مقامات پہلے ہی روشن ہو چکے تھے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کی اولین منزلوں میں سے ہے۔ اس لیے صرف فکرِ آزاد کا مخصوص مطالعہ کرنے والوں نے ہی اس پر خاص توجہ کی ہے اور ترجمان القرآن اور تذکرہ کا سرسری مطالعہ کرنے والوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ چونکہ ان دونوں تصانیف کے درمیان کوئی پندرہ برس کا وقفہ ہے' اس لیے اصولاً تذکرہ والے مولانا آزاد میں اور ترجمان القرآن کے مولانا آزاد میں فرق ہونا چاہیے اور ایسے لوگ بڑی قطعیت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے مولانا آزاد (اپنے بنیادی فکر کے لحاظ سے) بدل گئے تھے۔ بہرحال یہ نقطۂ نظر گفتگو کا موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن ہمیں پروفیسر محمد مجیب کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے بنیادی فکر میں) اس وقفہ کے دوران کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ لکھتے ہیں:

"مولانا آزاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ (خیالات کے ارتقا کی راہوں سے گزر کر) ایک مسلم لیڈر سے ترقی کر کے ہندوستان کے مدبر و رہنما بنے، تذکرہ میں

اس موڈ (کیفیتِ ذہنی) کا عکس نظر آتا ہے جس میں اثباتِ حق کے لیے جم جانے کا شوق و ولولہ غالب تھا اور مولانا کی یہ آرزو تھی کہ اس راہ میں ان کے ساتھ ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہو جائے جو ان کی روحانی زبان کو سمجھتے ہوں اور جنھیں ایک عظیم اخلاقی روایت کو زندہ رکھنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ یہاں ان کے اسلوب اور استدلال میں وہ ایک زیریں امکان، ایک گہری تمنا مخفی محسوس ہوتی ہے جو کلمۂ حق یعنی وحیِ الٰہی کی تشریح کی صورت میں ترجمان القرآن میں پوری ہوئی۔ تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں دیکھیے تو تذکرہ کے اندازِ خطیبانہ میں پُرجوش مبلغانہ مقصد کو ایک عالمگیر وسعت و اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

تذکرہ کا مطالعہ

یہ صحیح ہے کہ تذکرہ عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا۔ لیکن یہ تمام عالموں کے لیے بھی نہیں ہے، خواہ اسلام اور تاریخِ اسلام سے متعلق ان کی معلومات کتنی ہی گہری اور وسیع کیوں ہوں، اسے صرف وہی عالم قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے جنھوں نے مذہب کو جذبۂ محبت و خیر اور وسیع تر ہمدردیوں کے ساتھ سمجھا ہو۔ اس میں اس کشادہ دل اور بے تعصب راسخ العقیدگی کی ترجمانی کی گئی ہے جس سے سچی مذہبیت پیدا ہوتی ہے، سچی مذہبیت جو سرچشمہ ہے اس بابرکت ہمت اور عزیمت کا جسے ہم دنیا پرست عالموں، حد سے تجاوز کرنے والے صوفیوں اور بے دین اور ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں حق و صداقت کے لیے اٹھ کھڑی ہونے والی دینی شخصیتوں میں پاتے ہیں:

۱؎ محمد مجیب "تذکرہ - اے بائیوگریفی اِن سِمبلس"، ہمایوں کبیر (مرتب)، مولانا ابوالکلام آزاد ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۲

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے

ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تذکرہ کے مطالعہ کا آغاز اس کے مصنف کے حالات و واردات پر مشتمل اس کے آخری صفحوں (۳۰۹-۳۲۲) کی ان دو فصلوں سے کیا جائے جن میں اعترافِ گناہ کے بعد توبہ و انابت کی سعادت و انعام کا ذکر ہے اور جنھیں مصنف علام نے یہ کہہ کر قلم بند کیا ہے کہ "... کئی سو صفحے روشن دلانِ سلف کے تذکرۂ آثار و مناقب سے نورانی ہو چکے ہیں۔ اب دو چار صفحے اپنی سیہ رویوں اور سیہ بختیوں کے سوادِ تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں کہ تعرف الاشیاء باضدادھا!"[1] لیکن اس خیال کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں ظواہر کو ہی اصل اہمیت حاصل ہو گئی ہو، توبہ و استغفار کی داخلی کیفیات کا ذکر، استعاروں کی زبان ہی میں سہی، کس کی نظر میں قابلِ اعتنا ٹھہرے گا۔ مسلمانوں کے فکرِ مذہبی کی تاریخ کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا کہ گیارہویں صدی عیسوی میں شریعت اور طریقت میں ایک خوشگوار مفاہمت ہو گئی اور ایک عرصہ کے بعد برسرِ منبر کُھل کر یہ بات کہی جانے لگی کہ خدا کی نگاہ میں سچے احساس و اعترافِ گناہ کی بڑی قدر و منزلت ہے، لیکن اس کے باوجود ہم میں کتنے ہیں جو مولانا آزاد کے درجِ ذیل بیان اور اس کے معنی کے متحمل ہو سکیں گے، وہ کنایوں اور استعاروں کے پردے میں اپنی "در جوانی چنانکہ افتد و دانی" کی کہانی بیان کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ "غفلت ہر حال میں غفلت ہے اور ایک لمحۂ غفلت کے معاوضہ میں عمر بھر کا ماتم بھی کافی نہیں" اور پھر لکھتے ہیں:

"... بلاشبہ یہ لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں

۱؎ تذکرہ، ص ۳۰۹۔

پر گرادے۔ مقصد تو ساری باتوں سے اس تک پہونچنا ہی ہے۔۔۔ توفیقِ الٰہی
کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیتِ غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔۔۔ (میں نے)
جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہنمائیاں ملیں صرف اسی مرشدِ فیض
و ہادیِ طریق سے ملیں۔ درد بن کر آیا تھا، مگر درمان بن کر گیا۔ مرض بھی وہی تھا،
شفا بھی اسی سے ملی:

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

علم کا دروازہ اسی نے کھولا۔ عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی۔ معرفت کے صحیفے اس کی
زبان پر تھے۔ حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقایق
کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے
بتلائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی، دل اس نے بخشا،
کون سی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی۔۔۔ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اس کے
دارالشفاء سے نہ مل سکی؟

شاد باش اے عشقِ خوش سودایِ ما ‏ ‏ ‏ اے طبیبِ جملہ علتہائے ما!
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما ‏ ‏ ‏ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما!

اور یہ جو کچھ کہا گیا تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اپنے عیبوں کو بھی ہُنر بنا کر دکھلانا مقصود
ہے۔ جس عالم میں ہُنر کو بھی ہُنر سمجھنا معصیت ہو وہاں عیب کو حسن بنانے کا وہم
بھی گزرے تو کفر سمجھا جائے[1]

[1] تذکرہ، ص ۳۳۱-۳۱۸۔

ابن تیمیہ اور مولانا آزاد تذکرہ میں مولانا آزاد نے ان ائمہ مجتہدین اور علمائے حق کی بڑی
تعریف و توصیف کی ہے جنھوں نے قرآن و سنت کی عظمت اور برتری کو قائم رکھا، ان گنت
مصائب و آلام میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، علما و سوء کی حیلہ سازیوں
کا پردہ چاک کیا اور غیر منصف اور سخت گیر حکمرانوں کے ظلم و استبداد کو بے باکی سے چیلنج
کیا۔ انہیں میں حضرت امام احمد بن حنبل بھی ہیں جن کی شخصیت میں انہیں شاید اپنے وجود کا
وہ پیکر نظر آتا تھا جو اپنے وقت کے نام نہاد تجدد پسندوں اور عقلیت دوستوں کے مقابلہ
میں قرآن و سنت کی صداقتوں کا علمبردار تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے نویں صدی عیسوی میں
معتزلی حامیانِ عقلیت کے خلاف جنھیں وقت کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی،
ایک جرأت آموز موقف اختیار کیا تھا اور تن تنہا قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی
صداقت پر ایمان کو وقت کے مسلم معاشرے میں اور زیادہ مضبوط اور مستحکم
بنا دیا تھا۔

لیکن تذکرہ میں حنبلی مسلک کے شامی مصلح و مجتہد ابن تیمیہ کو زیادہ جگہ دی
گئی ہے۔ مولانا آزاد بار بار اپنے زمانے کی بے مثال شخصیت ابن تیمیہ کی تعریف
و توصیف اور ان کے لیے اپنے گہرے جذبۂ احترام کا اظہار کرتے ہیں۔ ان پر ابن تیمیہؒ
کی شخصیت، جذبۂ جہاد اور مجتہدانہ طرزِ فکر کا اثر کن کن اطراف و جوانب سے پڑا،
یہ الگ سے ایک مقالے کا موضوع ہے اور یہاں اس موضوع کو چھیڑنے کا موقع
نہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک مولانا آزاد کی شخصیت اور
مذہبی دانشوری پر ابن تیمیہؒ کے فکر و عمل کی مجاہدانہ و مجتہدانہ خصوصیات
کا اثر باقی رہا۔

ابن تیمیہؒ آزاد کے ہیرو تھے، ان کے روحانی رہنما، اس لیے کہ انھوں نے اپنے عہد کے مسلم سماج کے انحطاط و اضمحلال کو ایک تقدیری صورتِ حال نہیں تصور کیا۔ انھوں نے منگول حملہ آوروں کے خلاف مدافعت اور مزاحمت کی تنظیم کی، اپنے زمانے کے علماء کی اخلاقی خرابیوں اور مختلف صوفی سلسلوں کے پیرووں کے غیر محتاط رویے اور اعمال و رسوم کو جن کی سند کتاب و سنت میں کہیں نہیں ملتی تھی، ہدفِ ملامت بنایا، متکلمین و فلاسفہ، منطق کی جدلیات اور فلسفے کے مجرد تصورات کی سخت تردید اور تنقید کی اور اس بات پر زور دیا کہ قرآن کو قرآن ہی کی مدد سے اور اس حکمت و دانش کی روشنی ہی میں جو رسولِ کریمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی سنت کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے، صحیح صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔

اس طرح اپنے عہد کے مسلم معاشرہ کے عہدِ وسطیٰ کے اس مزاج کے خلاف جو صدیوں پُرانی صورتِ حال میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتا تھا، ایک باغی کی حیثیت سے مولانا آزاد کو مسلم ذہن کو تقلید کی پابندیوں سے آزاد کرانے اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی روح اجتہاد کو زندہ کرنے کی ابن تیمیہؒ کی کوششوں میں اپنے انقلابی خیالات کا اثبات اور جواز مل گیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ ہی سے مولانا آزاد نے یہ فیض حاصل کیا کہ جدید فلسفہ و علوم کے بعض ان بنیادی مفروضوں کی اندھی تقلید کے بجائے جن پر مغرب نے اپنے اس جھوٹے دعوے کی بنیاد رکھی تھی کہ سفید فام اقوام کی یہ ذمہ داری ہے کہ باقی ماندہ دنیا کو 'مہذب' بنائیں، انہیں ناقدانہ نظر سے دیکھیں اور

ان کی کمزوریوں کو واشگاف کریں۔

مولانا آزاد نے دیکھا کہ مغرب کی پروردہ جدید تعلیم کے سبب تشکیک والحاد کو تقویت مل رہی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا بلکہ انھوں نے ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کی حقانیت کو تذکرہ کے صفحات پر ایک پُراعتماد اور پُرجوش آہنگ و اسلوب کے توسط سے پیش کردیں جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ میں اعلائے کلمۃ الحق کی ایمان پرور مثالیں پہلے ہی سے موجود تھیں، مولانا نے محسوس کیا کہ آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ ہم میں حق و صداقت کو سمجھنے اور برتنے کا، جیسا کہ اس کا حق ہے، حوصلہ ہو، اعمال صالح کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردینے کا ولولہ ہو اور یہ عزم و ہمت کہ جب اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے تائب ہونے سے خوشی ہوتی ہے[1] تو ہم اپنی جدوجہد سے ایسے حالات پیدا کریں کہ دنیا میں فتنہ و شر اور بدی و گمرہی کا زور کم ہو۔

---

[1] دیکھئے صحیح مسلم، ج ۲، کتاب التوبہ، نولکشور پریس، لکھنؤ، ص ۳۵۵۔

مقالاتِ شبلی

حصہ اول تا حصہ ہفتم (مکمل سیٹ)

علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے اہم مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی اور تاریخی مقالات کا مجموعہ جن میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن رشد پر اہم مقالات بھی ہیں۔

قیمت حصہ اول ۴۰، دوم ۱۵، سوم ۲۵، چہارم ۲۵، پنجم ۲۰، ششم ۴۰، ہفتم ۲۰۔

"منیجر"

اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے

جناب محمد بدیع الزماں صاحب، پٹنہ

ایسے تو اقبال کا پورا کلام قرآن کی منظوم تفسیر ہے مگر جہاں تک قرآنی تلمیحات کا سوال ہے یہ ان کے کلام میں تین درج ذیل عنوانات کے تحت آتی ہیں۔ پہلا یہ کہ اقبال نے بہت اشعار میں قرآنی تلمیحات کو ہو بہو قرآن کے عربی متن کے الفاظ، فقرے یا آیات کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور ایسی ہی اصطلاحات کے اشاریے اس مضمون میں حروف تہجی کے اعتبار سے دیے جا رہے ہیں۔

دوسرا طریقہ ان قرآنی تلمیحات کا اقبال کے کلام میں یہ ہے کہ انھوں نے اشعار میں بجائے قرآن کے عربی متن کے الفاظ، فقرے یا آیات لانے کے پوری آیت کا منظوم ترجمہ شعر کے دونوں مصرعوں یا ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے، جیسے "بانگ درا" کی نظمیں "ترانۂ ملی" اور "طلوعِ اسلام" کے چوتھے بند کے علی الترتیب یہ اشعار:۔

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا — ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۹۶ کا منظوم ترجمہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں سورۃ الحج ۲۲ کی آیات ۲۶ تا ۲۹ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی طرح

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں ہو بہو سورۃ حٰم السجدۃ ۴۱ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۳ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔ ایسی تلمیحات کی فہرست بھی بہت طویل ہے جو اس مضمون کا موضوع نہیں۔

تیسری قسم اقبال کے کلام میں تلمیحات کی یہ ہے کہ انھوں نے اشعار میں قرآنی قصوں کو ایک شعر میں سمو دیا ہے جس کے لیے اس موضوع پر پورے قرآنی قصوں سے واقف ہونا ضروری ہے جو مختلف طریقوں سے مختلف سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ جیسے "بانگِ درا" کی نظمیں "جواب شکوہ" کے بارھویں بند اور "خضر راہ" کی ذیلی نظم "صحرا نوردی" کے علی الترتیب یہ اشعار:۔

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں — جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب — جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

پہلے شعر میں حضرت موسیٰ کے کوہِ طور پر خدائے تعالیٰ سے ملاقات کے قرآنی قصہ کی تلمیح کی گئی ہے جو سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۷ میں وارد ہوا ہے اور دوسرے شعر میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان لانے کی قصہ کی تلمیح ہے جس کی تفصیل سورۃ الانعام ۶ کے رکوع ۹ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ایسی تلمیحات کی فہرست بھی بہت لمبی ہے جو اس مضمون کا موضوع نہیں۔

ان تینوں قسم کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے مرتب کیا جانا اس لیے ضروری ہے کہ ایک تو عام طور سے مسلمان نہ تو قرآن کے عربی متن یا اس کے ترجمے پر اتنا عبور رکھتے ہیں کہ وہ کسی شعر میں ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کی تلمیح کو فوراً گرفت میں لا سکیں اور دوسرے اردو زبان کے متوسط درجہ کے قاری کے لیے تو یہ گرفت اور بھی مشکل ہے اس طرح نتیجتاً ایسی قرآنی تلمیحات سے ترتیب دیے گئے اقبال کے کلام کے قریب

پانچ سو اشعار ناقابلِ فہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس مضمون میں طوالت کے خوف سے صرف پہلی قسم کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے، ان تلمیحات سے ترتیب دیے گئے کل اشعار کے حوالہ جات کے ساتھ، دیے جا رہے ہیں جن کی تعداد ساٹھ ہے اور میری تحقیق کے مطابق ایسی تلمیحات کی یہی تعداد پورے کلام میں ہے۔ اس اشاریے میں پانچ اشاریے حدیث سے ماخوذ ہیں جن کا نمبر شمار ۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱ اور ۵۴ ہے۔ اس طرح اس مضمون میں ۶۵ تلمیحات کے اشاریے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اشاریے اقبال فہمی کی راہ عام کرنے اور اقبالیات کی تحقیق میں لگے لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے میں ممد و معاون ہوں گے۔

(۱) أَرِنِیْ : یہ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں وارد ہوا ہے اور اس سے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم "دل" میں ہے۔ باقی دو "بالِ جبریل" کی غزلیات ۲۰ اور ۴۱ میں۔ اس کے معنی ہیں: "مجھے یارائے نظر دے"۔

(۲) اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ : سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸ میں وارد ہوا ہے،

شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ — گواہی دی اللہ نے یہ کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ

اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۵۹ میں ہے۔

(۳) اَعْرَاف : اس کے معنی بلندیوں کے ہیں اور قرآن میں اس سے مراد ایک خاص مقام ہے جس کی تفصیل سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۵ اور ۶ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے کلام میں کل ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۶۰ میں ہے۔

(۴) اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ (۵) اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ : پہلی اصطلاح سورۃ یوسف ۱۲ کی آیت ۶۷ میں بمعنی "حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں چلتا" اور سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت

۴۱ میں بمعنی "اللہ حکومت کر رہا ہے" وارد ہوئی ہے۔ دوسری اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۲۰ میں بمعنی "ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف اور کہنگی نہ آئے" اور سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶ میں بمعنی "پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی"، سورۃ النور ۲۴ کی آیت ۴۲ میں بمعنی "بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے" اور سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۲ میں بمعنی "بادشاہی کا مالک" وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے چوتھے بند میں ہے۔ جن میں دونوں ساتھ لائی گئی ہیں۔

(۶) اَلَسْتُ : یہ اصطلاح سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۷۲ میں وارد ہوئی ہے۔ فقرہ یہ ہے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)۔ اسی آیت کو اقبال نے "بانگِ درا" کی نظم "سرگزشت آدم" میں "پیمان اولیں" سے موسوم کیا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضرب کلیم" کی نظم "شکست" میں ہے۔

(۷) اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ : یہ اصطلاح اس حدیث سے ماخوذ ہے: "شانِ فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے"۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں ہے۔

(۸) الٓمّٓ : قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں ۲۹ سورتوں کی پہلی آیت حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں جن سے شروع ہونے والی آخری سورۃ القلم ۶۸ ہے۔ "الٓمّٓ" کا حرف مقطع چھ سورتوں کی پہلی آیت میں آتا ہے۔ جن کا نمبر شمار ۲، ۳، ۲۹، ۳۰، ۳۱ اور ۳۲ ہے۔ یہ مقطعات اہل عرب کے لیے کوئی چیستاں نہ تھے کیونکہ وہ بالعموم جانتے تھے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بعد میں یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا، اس بنا پر مفسرین

کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہوگیا۔" الٓمٓ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر" بانگِ درا" کی نظم: "فلسفۂ غم" کا ہے۔ اس کے ساتھ سورۃ لگا دینے سے ابہام کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور" جزو" جو قرآن کے پارہ کو کہتے ہیں اور" کتاب" کا لفظ بھی ساتھ لانے سے، جو لفظ کہ سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۴۸ میں قرآن مجید کیلئے "اَلْكِتٰبَ" آیا ہے اس میں صنعتِ مراعات النظیر بھی آگئی ہے۔

(۹) اُمُّ الکتاب : اس کے معنیٰ ہیں" اصل کتاب" یعنی وہ منبع و سرچشمہ جن سے تمام کُتبِ آسمانی نکلی ہیں۔ یہ اصطلاح سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۹ اور سورۃ الزُّخروف ۴۳ کی آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے۔ سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۴۸ میں اسے" اَلْكِتٰبَ" بھی کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی مصرعہ" علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمُّ الکتاب" "ضربِ کلیم" کی نظم" علم و عشق" کے آخری بند میں ہے۔

(۱۰) اِنَّ الْمُلُوْكَ : یہ اصطلاح حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کے سلسلہ میں سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۳۴ میں وارد ہوئی ہے۔ اسے اقبال نے اصطلاح کے طور پر سامراجیت اور اس کے اثرات کے معنی میں اپنے کلام میں صرف ایک بار" بانگِ درا" کی نظم: "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم" سلطنت" میں استعمال کیا ہے۔

(۱۱) اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ : (فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے)۔ یہ فقرہ ہو بہو انہی الفاظ میں سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۵۵، سورۃ الروم ۳۰ کی آیت ۶۰، سورۃ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۳۳، سورۃ الجاثیہ ۴۵ کی آیت ۳۲ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۷ میں وارد ہوا ہے۔ علاوہ ازیں" وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا" کا فقرہ بھی سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۲۲، سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۴ اور سورۃ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۹ میں اسی معنیٰ میں وارد ہوا ہے۔ اس

فقرے سے تلمیح کے ساتھ اقبال نے" لسانُ العصر" اکبر الٰہ آبادی کے ایک مصرعہ کی تضمین "بانگِ درا" کی غزلیات حصۂ سوم کی آخری غزل کے آخری شعر میں کی ہے اور اس سے صرف یہی ایک شعر کلام میں ہے۔

(۱۲) بِسمِ اللّٰہ : (اللہ کے نام سے)۔ یہ مخفف ہے آیت" بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کا جسکے معنیٰ ہیں: "اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے"۔ یہ آیت قرآن میں دو بار وارد ہوئی ہے۔ پہلی بار سورۃ الفاتحہ ۱ کی پہلی آیت میں جو قرآن کی سب سے پہلی آیت ہے اور دوسری بار سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۳۰ میں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر" بانگِ درا" کی نظم: "قربِ سلطان" میں ہے۔

(۱۳) بشیری ، نذیری : قرآن میں الفاظ" بشیر" (بشارت دینے والا) اور" نذیر" (خبردار کرنے والا) رسول اللہؐ کی دعوت اور منصب کے سلسلہ میں بہت سی سورتوں میں وارد ہوئے ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۱۹، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۸۸، سورۃ ہود ۱۱ کی آیت ۲، سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۵۶، سورۃ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۴۵ اور سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۸ میں۔ اقبال کی یہ دونوں اصطلاحیں انہی دونوں الفاظ سے انہی قرآنی معنوں میں ماخوذ ہیں جن سے ان کے کلام میں کل دو اشعار ہیں اور دونوں اشعار میں یہ دونوں اصطلاحیں ایک ساتھ لائی گئی ہیں۔ پہلا شعر" بالِ جبریل" کی نظم" دین و سیاست" میں ہے جس میں" بشیری" سے مراد" دین" اور" نذیری" سے مراد "سیاست" ہے۔ دوسرا شعر" ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے پندرھویں بند میں ہے جس شعر کو سورہ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۱۰ کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۱۴) تَقْنَطُوا، لَا تَقْنَطُوا : جن کے معنی علی الترتیب مایوس ہونے اور

نہ ہونے کے ہیں۔ اقبال نے یہ دونوں اصطلاحیں علی الترتیب سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۵۶ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۵۳ سے اخذ کی ہیں۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "جبریل و ابلیس" میں ہے۔

(۱۵) چوبِ کلیم: (عصائے موسیٰؑ)۔ عصائے موسیٰؑ ان نو نشانیوں میں سے ایک ہے جن نشانیوں کے ساتھ خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ جن کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۱۰۱، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۰۳ اور سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵۶ میں وارد ہوا ہے۔ ان نو نشانیوں میں ایک نشانی "عصا" اور دوسری نشانی "یدِ بیضا" تھیں۔ عصا کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۸ میں وارد ہوا ہے۔ اسی سے اقبال نے "چوبِ کلیم" کی اصطلاح وضع کی جس سے ان کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ ایک شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۹ میں ہے اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم "اہلِ مصر سے" میں۔ یدِ بیضا کا ذکر اس مضمون میں نمبر شمار ۴۶ میں لایا گیا ہے۔

(۱۶) خُلُقِ عَظِیم: (اخلاق کا بلند مرتبہ)۔ یہ اصطلاح قرآن میں صرف ایک بار اور وہ بھی رسول اللہؐ کی شان میں سورۃ القلم ۶۸ کی آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے۔ اس پر ایک روایت بھی ہے کہ فرمایا حضورؐ نے کہ: "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "مسجدِ قرطبہ" کے چھٹے بند میں ہے۔

(۱۷) رحمٰن: (رحم کرنے والا)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "مردِ مسلماں" میں ہے جس میں انھوں نے سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی تلمیح کی ہے جس شعر میں مردِ مسلماں کی فطرت کی سورہ الرحمٰن ۵۵ کی صفات سے ہم آہنگی

بتائی گئی ہے۔

(۱۸) رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَك: (اے نبیؐ، تمھاری خاطر ہم نے تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کیا)۔ یہ فقرہ سورۃ الم نشرح ۹۴ کی آیت ۴ میں وارد ہوا ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم: جوابِ شکوہ کے چونتیسویں بند میں ہے۔

(۱۹) سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ: (اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح)۔ اقبال نے یہ اصطلاح حدیث سے اخذ کی ہے اور احادیث میں یہ سورۃ الاعلیٰ ۸۷ کی پہلی آیت سے لی گئی ہے۔ احادیث میں حضرت عقبہ بن عامر جہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہؐ نے سجدہ میں اسے پڑھنے کا حکم اسی آیت کی بنا پر دیا تھا اور "سبحان ربی العظیم" پڑھنے کا جو طریقہ حضورؐ نے رکوع میں مقرر فرمایا تھا وہ سورۃ الواقعہ ۵۶ کی آیت ۹۶ پر مبنی تھا۔ (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن المنذر)۔

(۲۰) سلسبیل: (جنت کا ایک چشمہ) یہ اصطلاح سورۃ الدھر ۷۶ کی آیت ۱۸ سے ماخوذ ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں صرف دو اشعار ہیں اور دونوں "بانگِ درا" میں ہیں۔ پہلا شعر نظم "عشرتِ امروز" میں ہے اور دوسرا نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم: "صحرانوردی" میں۔

(۲۱) شمس: (آفتاب)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم: "انسان اور بزمِ قدرت" میں ہے جس شعر کی وضاحت اس نظم کے پہلے تین اشعار کے ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن میں سورۃ کا نام صرف "الشمس" ہے مگر اقبال نے اپنے اس شعر میں اس سورۃ "الشمس" ۹۱ کی پہلی آیت میں وارد "والشمس"

کی تلمیح کی ہے۔

(۲۲) عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ : (ناموں کا علم)۔ یہ ترکیب سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۳۱ میں وارد ہوئی ہے جس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "ذکر و فکر" میں ہے۔

(۲۳) قلب سلیم : (صحیح سلامت دل) قرآنی معنوں میں "قلبِ سلیم" سے مراد ایسا دل ہے جو تمام اعتقادی اور اخلاقی برائیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو اور جس میں نافرمانی اور سرکشی کے جذبے، یا برے میلانات اور ناپاک خواہشات کے جذبوں کے پائے جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا ہو۔ یہ اصطلاح قرآن میں سورۃ الشُّعَرَآء ۲۶ کی آیت ۸۹ اور سورۃ الصّٰٓفّٰت ۳۷ کی آیت ۸۴ میں وارد ہوئی ہے اور دونوں بار حضرت ابراہیمؑ کے شان میں آئی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم: "جوابِ شکوہ" کے اکیسویں بند میں ہے اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم: "فقر و ملوکیت" میں۔

(۲۴) قُلِ الْعَفْوَ : (کہو، جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو)۔ "عفو" کا یہی معنی حضرت عطاؒ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس فقرہ سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "اشتراکیت" میں ہے جو ماخوذ ہے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۱۹ سے۔

(۲۵) قُلْ هُوَ اللّٰه : (کہو، وہ اللہ ہے)۔ اقبال نے سورۃ الاخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" سے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ایک "قُلْ هُوَ اللّٰهُ" اور دوسری "هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" اور دونوں کو الگ الگ شعر میں اس برجستگی سے استعمال کیا ہے کہ ہر نکتہ شعر کے موضوع کی مناسبت سے پوری آیت کا حق ادا کرتا ہے۔

دوسرے ٹکڑے کے لیے دیکھیں اسی مضمون کا نمبر شمار ۶۲۔ "قُلْ هُوَ اللّٰه" سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "توحید" میں ہے۔

(۲۶) قُمْ : (اٹھ)۔ قُم عربی لفظ ہے اور امر کا صیغہ ہے بمعنی اٹھ۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم: "صقلیہ" کے پہلے بند میں ہے۔

(۲۷) قم باذنِ اللہ : (اللہ کے حکم سے اٹھ) اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک منفرد شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "خانقاہ" میں ہے۔ علاوہ ازیں "ضربِ کلیم" میں "قم باذن اللہ" نام کی ایک نظم ہی ہے جس میں تین اشعار ہیں اور اسے مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی دو اشعار میں ردیف کے طور پر لایا گیا ہے۔

(۲۸) کُنْ : (ہو جا) "کن" کی اصطلاح قرآن میں "فَیَکُوْنُ" کے ساتھ سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۴۷ اور ۵۹ اور سورۃ یٰسین ۳۶ کی آیت ۸۲ میں وارد ہوئی ہے۔ "کُن" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں اور دونوں "بانگِ درا" کی نظم: "شمع" کے پانچویں بند میں ہیں۔

(۲۹) کُنْ فَیَکُوْن : (ہو جا اور وہ ہو گیا)۔ آیات کے حوالے اوپر نمبر شمار ۲۸ میں دیے جا چکے ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳ (دوم) میں ہے۔

(۳۰) کاف و نون : (کُنْ)۔ یہ کنایہ ہے لفظ "کن" سے۔ جس پر آیات کے حوالے نمبر شمار ۲۸ میں دیے جا چکے ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ہے۔

(۳۱) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه : (نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ کے) اس کلمۂ طیبہ کا ذکر

سورۃ ابراہیم ۱۴ کے رکوع ۴ میں تمثیلی پیرایۂ بیان میں وارد ہوا ہے، جس کی ضد کلمۂ خبیثہ ہے جس کا بھی ذکر اسی پیرایۂ بیان میں اسی سورۃ کے اسی رکوع میں وارد ہوا ہے۔ ایک روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ انھوں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ آپؐ کی شفاعت کا سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا قیامت کے دن کون شخص ہوگا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

"سب سے زیادہ سعادتمند اور نفع اٹھانے والا میری شفاعت کے ساتھ وہ شخص ہوگا جو دل کے خلوص کے ساتھ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے۔"

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل آٹھ اشعار ہیں۔ ایک منفرد شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۳ میں ہے۔ باقی سات "ضربِ کلیم" کی نظم: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" میں ہیں جن میں مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی چھ میں یہ بطور ردیف لایا گیا ہے۔ اقبال نے اس کے ٹکڑے کر کے چار مزید اصطلاحیں وضع کی ہیں جن کا ذکر اگلے نمبر شمار ۳۲ اور ۳۴ تا ۳۶ میں لایا گیا ہے۔

(۳۲) لَآ اِلٰہَ اِلَّا : یہ اصطلاح قرآن میں الگ نہیں آئی مگر اقبال نے اسے نمبر شمار ۳۱ کو مخفف کر کے خود وضع کی ہے اور اسے اپنے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی غزل ۲۲ میں استعمال کیا ہے مگر پورے کلمۂ طیبہ کے معنی فراہم کر دیا ہے۔

(۳۳) لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ : (اس ایک رب کے سوا کوئی اور معبود نہیں)۔ یہ فقرہ ہو بہو قرآن کی سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۵۵، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۲، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۰۶، سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶، سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ اور سورۃ الحشر ۵۹ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے

اقبال کے کلام میں کل ۲ دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۹ (اول) میں ہے اور دوسرا "ارمغانِ حجاز" کی نظم: "مسعود مرحوم" میں۔

(۳۴) لَا و اِلَّا : (نہیں اور سوا)۔ اقبال نے لَآ اِلٰہَ کے لیے "لَا" اور "اِلَّا اللّٰہُ" کے لیے "اِلَّا" کی اصطلاحیں لا کر لَا و اِلَّا کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل ۲ دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱ (دوئم) میں ہے اور دوسرا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "لا و اِلَّا" میں ہے

(۳۵) لَا و اِلَّا اللّٰہ : (نہیں اور سوا اللہ کے)۔ یہاں بھی اقبال نے لَآ اِلٰہَ کی جگہ صرف لَا کو الگ اصطلاح بنایا ہے اور اِلَّا اللّٰہ کو الگ اصطلاح۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "سوامی رام تیرتھ" میں ہے جس میں انھوں نے اللہ سے ملنے کی آرزو کو اِلَّا اللّٰہ سے تعبیر کرتے ہوئے پہلے لَا کی منزل سے گزر کر اپنی اور کائنات کی نفی کرنی لازمی قرار دیا ہے۔

(۳۶) لَآ اِلٰہَ : (نہیں ہے کوئی معبود)۔ اقبال نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی جگہ صرف لَآ اِلٰہَ کی ایک اصطلاح بھی وضع کی ہے۔ اس لیے کہ ایک مومن جب صرف لَآ اِلٰہَ کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سارے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔ مگر نفی کر کے وہ خاموش نہیں رہ جاتا بلکہ اس کا دل، اس کا ضمیر اور خود اس کا اپنا وجود ساتھ ساتھ اِلَّا اللّٰہُ کا بھی اثبات کرتا ہے، یعنی "سوا اللہ کے"۔ اس لیے اقبال صرف لَآ اِلٰہَ کہہ کر ہر ایسے شعر میں جہاں یہ اصطلاح لائی گئی ہے اس کے استعمال کی برجستگی سے پورے کلمۂ طیبہ (نمبر شمار ۳۱) کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ اصطلاح کلمۂ طیبہ کے معنی میں

اپنے کلام میں بارہ اشعار میں استعمال کیا ہے۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "تضمین بر شعر انیسی شاملو" میں ہے۔ تین اشعار "بالِ جبریل" کی غزلیات ۸ (دوئم)، ۳۲، اور ۴۸ میں ہیں۔ پانچواں شعر "بالِ جبریل" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے چوتھے بند میں ہے۔ چھ اشعار "ضربِ کلیم" کی نظمیں "تصوف"، "نکتۂ توحید"، "حکیم نطشہ"، "جاوید سے"، "مسجدِ قوت الاسلام" اور "محراب گل افغان کے افکار" کے انیسویں بند میں ہیں اور بارہواں شعر "ارمغانِ حجاز" کی بارہویں رباعی میں ہے۔

(۳۷) لات ومنات: اقبال نے لات ومنات کی اصطلاحیں علی الترتیب سورۃ النجم ۵۳ کی آیات ۱۹ اور ۲۰ سے اخذ کی ہیں۔ یہ دونوں بت ان بہت سے بتوں میں سے ہیں جنھیں قبل از اسلام قریش ان کے عمدہ کارناموں کی وجہ سے پرستش کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کی پرستش سبھی کیا کرتے تھے اور باقی کے خاص قبائل۔ منات مردبت تھا۔ "لات" و "منات" کی اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں کل آٹھ اشعار ہیں۔ جن میں پہلے پانچ "ضربِ کلیم" کی نظمیں "نماز"، "تیاتر"، "مخلوقاتِ ہنر"، "بلشویک روس" اور "محراب گل افغان کے افکار" کے اٹھارویں بند میں ہیں۔ باقی تین "ارمغانِ حجاز" کی نظمیں "ابلیس کی مجلس شوریٰ"، "عالم برزخ" اور "مسعود مرحوم" میں ہیں۔

(۳۸) لاتی ومناتی: یہ اصطلاحیں نمبر شمار ۳۷ سے وضع کی گئی ہیں۔ ان سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" میں ہے۔

(۳۹) لَا تَخَفْ: (مت ڈر)۔ یہ اصطلاح اقبال نے سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۳۱ اور سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۱۰ سے اخذ کی ہے۔ دونوں بار یہ فقرہ حضرت موسیٰؑ کے

کوہِ طور پر خدائے تعالیٰ سے ملاقات کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ (دوئم) میں ہے۔

(۴۰) لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو) یہ فقرہ قرآن میں کئی سورتوں میں وارد ہوا ہے جیسے سورۃ الشعراء ۲۶ کی آیت ۲۱۳، سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۱۱۷ اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ میں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "لاہور وکراچی" میں ہے۔

(۴۱) لَا تَذَرْ: (نہ چھوڑ)۔ یہ فقرہ سورۃ نوح ۷۱ کی آیت ۲۶ میں طوفانِ نوحؑ کے وقت حضرت نوحؑ کی زبان پر رکھا گیا ہے۔ نہ چھوڑنے کے معنی ہی میں یہ فقرہ سورۃ المدثر ۷۴ کی آیت ۲۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "طارق کی دعا" میں ہے۔

(۴۲) لَا شَرِیْکَ لَهٗ: (جس کا کوئی شریک نہیں)۔ یہ فقرہ سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۶۳ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے دوسرے بند میں ہے۔

(۴۳) لَا شَرِیْکَ: (کوئی شریک نہیں)۔ یہ بھی نمبر شمار ۴۲ کے مضمون میں اقبال کے کلام میں آیا ہے۔ جس سے صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" میں ہے جس شعر کے دوسرے مصرعہ میں سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۱۱ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔

(۴۴) لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوَ: یہ فقرہ اقبال نے ہم معنی قرآنی آیات سے خود وضع کی ہے۔ ہم معنی آیات سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۱۳۹ اور ۱۵۹ اور ۱۶۰، سورۃ المائدہ

۵ کی آیات ۵۵ اور ۵۶، سورۃ محمد ۴۷ کی آیت ۳۵ اور سورۃ المجادلہ ۵۸ کی آیت ۲۱ ہیں۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے بارہویں بند میں ہے۔

(۴۵) لَا یَحْزَنُوْنَ: (نہ غمگین ہوں گے)۔ یہ اصطلاح قرآن کی بہت سی سورتوں میں وارد ہوئی ہے جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۳۸ اور ۲۶۲، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۱۶۹ اور ۱۷۰، سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۶۹، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۴۸، سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۳۵ اور ۴۹، سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۶۲، سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۶۱، سورۃ حٰمٓ السجدہ ۴۱ کی آیت ۳۰، سورۃ الزخرف ۴۳ کی آیت ۶۸ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۳ ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف ایک شعر "بالِ جبریل" کی ایک دعائیہ رباعی میں ہے۔

(۴۶) لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادْ: (وعدہ سے ٹلنے والا نہیں)۔ یہ فقرہ الفاظ کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۰، سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۹، سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱ اور سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۴ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں کل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم: "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم "دنیائے اسلام" میں ہے اور دوسرا اسی مجموعہ کی غزلیات حصہ سوم میں۔

(۴۷) لَنْ تَرَانِیْ: (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا)۔ یہ جواب خدائے تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دیا تھا جو جواب کہ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں وارد ہوا ہے۔ اسے اس مضمون کے نمبر شمار ۱ کے ساتھ پڑھیں۔ اس سے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلے دو اشعار "بانگِ درا" کی غزلیات حصہ اول و حصہ دوئم میں ہیں اور تیسرا "ضربِ کلیم" کی نظم "خاقانی" میں۔

(۴۸) حدیث لن ترانی: (لن ترانی کا قصہ)۔ یہ ترکیب اقبال نے نمبر شمار ۴۷ سے وضع کی ہے۔ یہ ترکیب کلام میں صرف دو رباعیوں میں آئی ہے۔ پہلی رباعی "بالِ جبریل" میں ہے اور دوسری "ارمغانِ حجاز" کی نظم "تصویر و مصور" میں۔

(۴۹) لولاك: اس اصطلاح سے اقبال کی مراد ذاتِ محمدیؐ ہے اور درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:-

"لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ"　　اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ کائنات پیدا نہ کرتا

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم: "بلادِ اسلامیہ" میں ہے۔ دوسرا "بالِ جبریل" کی غزل ۴۷ میں اور تیسرا اسی مجموعہ کی ایک رباعی میں۔

(۵۰) لولاکی: یہ اصطلاح اقبال نے نمبر شمار ۴۹ سے وضع کی ہے جس سے ان کی مراد حضورؐ کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری اور روحانیت کی شان ہے۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں ہے۔

(۵۱) صاحبِ لولاك: اس سے اقبال کی مراد حضورؐ کا اتباعِ کامل یا غلام ہے۔ یہ ترکیب بھی اقبال نے نمبر شمار ۴۹ سے وضع کی ہے۔ اس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۰ (دوئم) میں ہے۔

(۵۲) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی: (انسان کے لیے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے)۔ یہ سورۃ النجم ۵۳ کی پوری آیت ۳۹ ہے۔ یہ آیت اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بانگِ درا" کے ظریفانہ" کے ایک شعر میں آئی ہے۔

(۵۳) مَازَاغَ : (آنکھیں نہیں چوندھیائیں)۔ یہ اصطلاح سورۃ النجم ۵۳ کی آیت ۱۷ میں واقعۂ معراج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی غزل (بعد از نظم "اساتذہ") میں ہے۔

(۵۴) مَاعَرَفْنَا : یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:

مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ — اے خدا! ہم نے تجھکو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے۔

اس اصطلاح سے کلام میں ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی غزلیات حصہ اول میں ہے۔

(۵۵) متاعِ غرور : (ظاہر فریب چیز)۔ یہ اصطلاح سورۃ آل عمران ۳ کی آیت ۱۸۵ میں وارد ہوئی ہے اور اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" میں ہے۔

(۵۶) نشور : (دوبارہ زندہ ہوکر حاضر ہونا)۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ دو "بالِ جبریل" کی غزل ۱۲ (اول) اور نظم "دعا" میں اور تیسرا "ضربِ کلیم" کی غزل بعد از نظم "فقر و راہبی" میں۔ یہ اصطلاح سورۃ ملک ۶۷ کی آیت ۱۵ میں وارد ہوئی ہے۔ ایسے تو "نشور" کے معنی قیامت کے ہیں مگر قرآن میں قیامت ہی کے پس منظر میں یہ دوبارہ زندہ کیے جانے کے معنی میں بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اقبال نے "بالِ جبریل" کے دونوں اشعار میں اسے قیامت کے معنی میں اور تیسرے شعر میں دوبارہ زندہ کیا جانا مراد لیا ہے۔ اسی معنی میں سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۲۱ میں "یُنْشِرُوْنَ" کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔

(۵۷) وَالنَّجْم : (تارہ)۔ اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ النجم ۵۳ کی پہلی آیت

سے اخذ کی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "معراج" میں ہے۔

(۵۸) وَالنُّوْر : اقبال نے سورۃ النور ۲۴ سے یہ اصطلاح وضع کی ہے گرچہ سورۃ کا نام صرف "النور" ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک شعر "بالِ جبریل" کی نظم "پیامِ صبح" میں ہے جس میں انھوں نے "سورۂ والنور" استعمال کیا ہے۔

(۵۹) وَكُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ : (تم خود ہی اس (قیامت) کے جلد آنے کا تقاضا کر رہے تھے)۔ یہ فقرہ سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۵۱ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" میں ہے۔

(۶۰) ھُوْ : یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو ضمیر کے طور پر آتا ہے۔ اس کے ایک معنی تو خدا کے ہیں۔ اس لیے ہم ریگستان یا کسی سناٹے کو "ہو کا عالم" کہتے ہیں یعنی وہاں خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں۔ اس کے دوسرے معنی عربی میں شور مچانے یا ڈرانے کے ہیں اور اردو میں یہ اس معنی میں بھی مستعمل ہے۔ ھُوْ کے معنی اشارے کے بھی آتے ہیں اور یہ معنی اسوقت پیدا ہوسکتا ہے جب ھُوْ کو لَآ اِلٰہ کا مخفف قرار دیا جائے۔

"ھُوْ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے پچیسویں بند میں ہے اور باقی دو "ارمغان حجاز" کی نظم: "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں۔ پہلے شعر میں ھُوْ سے مراد رحمتِ باری ہے۔

(۶۱) اللہ ھُوْ : اس سے اقبال عشقِ الٰہی میں گرویدگی مراد لیتے ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں پانچ اشعار ہیں۔ جن میں چار "بالِ جبریل" کی نظمیں "دعا" "مسجد قرطبہ" (تیسرا بند)، "جبریل و ابلیس" اور ایک رباعی میں ہیں۔ پانچواں شعر

"ارمغان حجاز" کی ساتویں رباعی میں ہے۔

(۶۲) **ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ** : (وہ اللہ ہے یکتا)۔ جیسا اس مضمون کے نمبر شمار ۲۵ میں عرض کیا گیا اقبال نے سورۃ الاخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت کے دو ٹکڑے کر کے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں اور یہ اس کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے دسویں بند میں ہے۔

(۶۳) یَدُ اللّٰہِ: (اللہ کا ہاتھ)۔ اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۱۰ سے وضع کی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ جن میں دو "بالِ جبریل" کی غزل ۴۸ اور نظم "مسجدِ قرطبہ" کے پانچویں بند میں ہیں۔ اور تیسرا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے چودھویں بند میں ہے۔

(۶۴) یَدِ بیضا: جیسا اس مضمون کے نمبر شمار ۱۵ میں عرض کیا گیا "یدِ بیضا" نو نشانیوں میں ایک نشانی ہے۔ "یدِ بیضا" کی اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے اقبال کے کلام میں صرف دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ا (دوئم) کے تیسرے بند میں ہے اور دوسرا "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں۔ اقبال نے ان ہی معنوں میں "یدِ بیضا" کی جگہ "بانگِ درا" کی نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") کے ایک شعر میں "دستِ موسیٰ" کی ترکیب لائی ہے۔

(۶۵) یَنْسِلُوْن: (نکل پڑیں گے) یہ لفظ سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۹۶ اور سورۃ یٰسین ۳۶ کی آیت ۵۱ میں وارد ہوا ہے۔ پہلی آیت میں قیامت کے قبل یاجوج اور ماجوج کے نکل پڑنے اور دوسری آیت میں حشر کے وقت مردوں کے اپنے اپنے قبروں سے نکل پڑنے کے سلسلہ میں یہ لفظ لایا گیا ہے۔ اس لفظ سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" میں ہے۔

نوٹ: ان ۶۵ تلمیحات کے تحت ۱۱۱۸ اشعار آتے ہیں جن اشعار کے بھی تفصیلی حوالے اس مضمون میں دیے گئے ہیں۔

مشرقی بنگال (بنگلا دیش) اور اردو ادب
(۱۸۰۱ء تا ۱۹۴۷ء)

از ڈاکٹر کلثوم ابو البشر۔ ڈھاکہ

شمالی ہند میں اردو زبان کے وجود میں آنے کے زمانے سے ہی بنگال کے مسلمانوں کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی کے آخر تک یہاں اردو کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے مغربی بنگال کے شہر کلکتہ کی ادبی اہمیت مسلّم ہو چکی تھی اور نثر اردو میں رنگ برنگ پھول کھل اٹھے تھے اس وقت بنگلا دیش کے مختلف اضلاع میں بھی کئی اردو شعراء و ادبا منظرِ عام پر آئے۔ جن کے کارنامے شاعری کی متعدد اصناف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بنگلا دیش کی جنوبی سرحد چاٹگام سے لے کر شمال میں رنگپور تک اردو زبان و ادب کا چرچا تھا۔ پایۂ تخت ڈھاکہ کو سب اضلاع پر برتری حاصل رہی۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی کو شرفاء کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بنگلا دیش کے کئی ضلعوں نے اردو ادب کے خزانے میں انمول کتابوں کا اضافہ کیا۔ اردو کی یہ نثری کتابیں زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور حدیث و فقہ سے متعلق تھیں۔ شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی تھی مگر برائے نام۔ بنگلا دیش کے کئی قادر الکلام شعراء آج بھی ادب اردو میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ مقالہ میں، میں نے مشرقی بنگال یا بنگلا دیش کے صوبہ "ڈھاکہ" کے ادبا و شعرا کا تذکرہ نہیں کیا ہے کیونکہ اس پر میرا مقالہ "ڈھاکہ میں اردو ادب — بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک" ماہنامہ 'ماہ نو' لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء میں شایع ہو چکا ہے۔ یہاں بنگلا دیش کے چند اہم اضلاع کے شعرا و ادبا کی ادبی خدمات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سلہٹ:۔ بنگلا دیش کے شمال مشرق میں سلہٹ کا خوبصورت پہاڑی سلسلہ ہے جہاں حضرت شاہ جلال تبریزی کی تبلیغِ اسلام سے اسلام کی جڑیں مضبوط و مستحکم ہو چکی تھیں۔ بہت سے درویش، علما اور اولیا ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اس لیے اس علاقے میں فارسی، عربی اور اردو کا خاصا چرچا رہا۔ یہاں کے زیادہ تر شعرا اور ادبا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، انھوں نے مذہبی رسائل اور دینی معلومات سے پُر کتابیں تصنیف کیں۔ ان مصنفین میں حاجی اللہ بخش، سعید بخت مجموعہ دار، اشرف علی مستؔ، حاجی عبداللہ آشفتہ، عبدالمنعم ذوقیؔ، ابو نصر وحید، نصیر الدین حیدر ساؔمی اور مولوی ماجد علی قابلِ ذکر ہیں

حاجی اللہ بخش اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اقبال عظیم نے ان کی اردو تصانیف میں 'دیوان حامد'، مسائل ضروریہ، تحفۃ الاحباب اور برہان الموحدین کا نام لیا ہے[1]

سعید بخت مجموعہ دار، حافظ اکرام احمد ضیغمؔ کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی

[1] مشرقی بنگال میں اردو، ص ۳۴۴، مطبوعہ ڈھاکہ، سنہ ۱۹۵۴ء۔

دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ انہیں تاریخ گوئی کا بھی بڑا شوق تھا۔ 'مخلص العقائد' مطبوعہ سنہ ۱۲۷۱ھ اور رسائل موتی مطبوعہ ۱۲۷۵ھ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔

حکیم اشرف علی مستؔ (ولادت ۱۲۳۶ھ — سنہ ۱۳۰۳ھ) بھی کثیر التصانیف تھے۔ انہیں کیمیاگری اور طب کا شوق تھا۔ اس لیے علم کیمیاگری پر انھوں نے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے اردو میں لکھے ہیں۔ جن میں رسالۂ چیچک، رسالۂ طاعون، رسالۂ ہیضہ، رسالۂ کشتی، رسالۂ دافع سموم اور رسالۂ تصویر غم اہم ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'اشرف البیان فی حکمت الایمان' سنہ ۱۳۰۱ھ میں لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی۔

حاجی عبداللہ آشفتہ شاعر کے ساتھ ایک بہترین نثار بھی تھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی ریڈیائی تقریر میں ان کی ایک مثنوی 'گلِ دوستانہ' کا تذکرہ کیا ہے۔ آشفتہ، عبدالغفور نساؔخ کے ہم عصر تھے۔ نساؔخ نے 'سخن شعرا' میں ان کا ایک شعر درج کیا ہے۔

دیکھنا شوقِ شہادت عاشقِ دل گیر کا
کیا تڑپ کے چوم لیتا ہے گلا شمشیر کا

نصیر الدین حیدر ساؔمی ڈھاکہ کے شرفا میں سے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ساری زندگی سلہٹ میں گزاری۔ ان کی تصنیف 'سہیل یمن' یعنی تاریخ جلالی ایک مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے سلہٹ کے شاہ جلال تبریزی کے حالات لکھے ہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن ضیاؔ کی کتاب 'احسن العقائد' میں اہلِ سنت کے عقیدوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے نواب احسن اللہ شاہیںؔ کے نام معنون ہے اور کانپور

سے ۱۳۰۰ھ میں شایع ہوئی۔

مولوی عبدالمنعم ذوقی کی کتاب 'اخلاق احمدی' آگرہ سے ۱۸۹۱ء میں طباعت پذیر ہوئی۔ دینی معلومات سے پُر یہ کتاب رسول اکرمؐ کی زندگی اور ان کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالتی ہے۔

مولوی ماجد علی نے 'مراتب الدین' کے نام سے ایک چھوٹا سا چوبیس [۲۴] صفحات کا رسالہ کانپور سے ۱۳۰۸ھ میں شایع کیا۔

شاہ اسماعیل فضل الرحمن آلم صاحب دیوان تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں اسی صفحات کا انکا دیوان شایع ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ محمد حسن، حاجی جلال بخش، مولوی فرجام علی بیخود، مولوی محمد علی احمد خاں اور مولوی عبدالعزیز بھی سلہٹ کے باشندے تھے، جنھوں نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔

چاٹگانگ: جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے بنگلادیش کی بندرگاہ چاٹگانگ میں عرب تجار کی آمد قبل از اسلام شروع ہو چکی تھی۔ بعد از اسلام بھی اس شہر میں مسلمانوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ انھوں نے یہاں کے باشندوں سے شادی بیاہ کر کے اپنی تجارت کو اور مضبوط بنایا۔ اس لیے مذہبی لحاظ سے آج بھی یہ شہر اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہاں پر کئی خاندان ایسے ہیں جن کے آبا و اجداد عربی النسل تھے۔ چاٹگانگ کی بنگلا بولی میں عربی کا اثر اس قدر پڑا کہ حرف 'پ' عربی کی طرح اس بولی سے خارج ہو گیا۔ چنانچہ چاٹگامی بنگلا بولی میں پانی کو فانی اور پان کو فان بولا جاتا ہے۔ اسلام اور اس کے اصولوں کی پابندی میں اس ضلع کے لوگوں نے اردو، فارسی اور عربی زبانوں کو

اپنایا۔ یہاں اردو اور فارسی کے کئی شعرا و ادبا نے اپنی تصانیف سے اردو ادب کے ذخیرے کو وسیع بنایا۔

مولوی دلیل الرحمن اردو کے نامی شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے اردو میں ایک مثنوی 'دلآرام' لکھی۔

منشی غلام حیدر عزت، سررشتہ دار فورٹ ولیم کالج کلکتہ تھے۔ ان کا خاندان چاٹگانگ سے منتقل ہو کر کلکتے میں بس گیا تھا۔ وہیں انھوں نے منشی وارث کی فارسی مثنوی "گلشن عشق" کا ترجمہ اردو میں "حسن و عشق"[1] کے نام سے کیا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ان کے بیٹے مصطفیٰ حیدر بھی صاحب دیوان تھے۔

مولانا عبدالاول کثیر التصانیف عالم تھے۔ انھوں نے لاتعداد دینی رسائل لکھے۔ 'التحقیقات الخطیرہ' انکی اردو کتاب ہے جو ڈھاکہ سے چھپی۔

مولوی ضمیرالدین چاٹگامی نے اردو میں پند و نصائح پر مشتمل تقاریر کا ایک مجموعہ 'ہدیۂ ضمیر عرف وعظ بے نظیر' کے نام سے شایع کیا۔

مولوی سعیدالرحمن نے ایک سو بیس [۱۲۰] صفحات پر مشتمل اپنی کتاب "تذکرۂ راشدین" ڈھاکہ سے شایع کی۔

شاہ بدیع العالم ابوالعلائی نے 'آئینۂ جہانگیری' تصنیف کی۔ یہ کتاب ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شایع ہوئی۔

مولوی اکرام علی نے چالیس [۴۰] حدیثوں کا اردو ترجمہ 'منہاج المومنین' کے نام سے کیا اور سید حمید الرحمن نے 'حکمت افلاطون' لکھی جو کانپور سے ۱۳۲۲ھ میں طبع پذیر ہوئی۔

---

[1] اس کتاب پر میرا تحقیقی مقالہ نوائے ادب بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی امین الحق نے 'تحفۃ الاحسان' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ابو الفتح احسن اللہ نے احسن الانشاء
نامی کتاب کانپور سے ۱۳۱۷ھ میں شایع کی۔

مولوی ظہور اللہ رمز اور مولوی وجہ اللہ ساقی اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے
شاعر تھے اور ناسخ کے ہم عصر تھے۔ ساقی نے ایک فارسی مرثیہ اپنے چچا کی وفات کے
بعد 'غم عم' تحریر کیا۔

مولوی ابوالمحاسن' ناسخ کے شاگرد عزیز تھے۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں
قادر الکلام تھے۔ ان کی کتاب 'الفوز العظیم فی مولد النبی الکریم' کلکتے سے ۱۳۰۵ھ میں چھپی۔

مولوی مظہر الحق مظہر اپنے وقت کے مشہور عالم و فقیہ تھے۔ انہوں نے کانپور میں
کئی سال تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ 'انشائے مظہر' ان کی مشہور کتاب ہے جو ۱۳۱۰ھ
میں کانپور سے شایع ہوئی۔

مولانا عبد الہادی نے بچوں کے لیے حنفی مسائل و عقائد پر مشتمل ایک درسی کتاب
'ہادی العقائد' تصنیف کی جو ۱۹۰۲ء میں کلکتے سے چھپی۔ تصوف اور تمہید ایمان کا دوسرا رسالہ
'لذت الایمان' کلکتے سے ۱۲۹۴ھ میں شایع ہوا تھا۔

محمد عبد العلی ورتی اردو' فارسی اور عربی کے شاعر تھے۔ انہوں نے 'ارمغان احباب'
کے نام سے ان تینوں زبانوں کے مشہور شعرا کا مجموعۂ کلام ترتیب دیا۔

مولوی محمد علی اسلام آبادی نے 'تحفۂ حنیفہ' مرتب کی اور مولوی صفی اللہ قادری
نے 'فیوضات غوثیہ' لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں کلکتے سے شایع ہوئی۔

عبد الحئی بن مولانا عبد الحکیم، سید امیر علی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔
عربی اور فارسی کی کتابوں کے ترجموں میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ فقہ حنفی کی مشہور

کتاب 'ہدایہ' کے ترجمے میں ان کی سعی و کوشش اہمیت رکھتی ہے۔ افسوس بیالیس ۴۲ سال
کی عمر میں ہی انکا انتقال ہوگیا۔

فریدپور: سلہٹ کے مجموعہ دار خاندان کی طرح فریدپور میں 'قاضی خاندان'
کے افراد نے اردو اور فارسی کی اعلا خدمات انجام دی ہیں۔ ان حضرات میں فقیر محمد،
عبد الغفور نساخ، شمس کلکتوی' مولوی عبد الباری صید اور مولوی حفیظ الدین شہید
قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس ضلع میں اور بھی اردو و فارسی داں اہل فن موجود
تھے، جن میں مولوی محمد فاضل، مولوی عبد الجبار' مولوی سراج الدین سراج، مولوی محمد علی
افسر' رحمن بخش شاداں اور مولوی امجد علی مشہور ہیں۔

قاضی فقیر محمد ۱۷۷۴ء میں فریدپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے عبد الغفور نساخ
کا نام بنگلادیش کی اردو تاریخ میں زندۂ جاوید بن گیا ہے۔ قاضی فقیر محمد اپنے آبائی
وطن فریدپور کو چھوڑ کر کلکتے جا بسے۔ انہیں حدیث' تاریخ اور فقہ پر عبور حاصل تھا۔
ان کی مشہور کتاب 'جامع التواریخ' اس زمانے میں تین بار طباعت کا شرف حاصل
کر چکی تھی۔ پہلی بار یہ فارسی کتاب ۱۲۸۰ھ/۱۸۳۶ء میں کلکتے سے شایع ہوئی تھی
ان کی تاریخ دانی کا اعتراف کرتے ہوئے BRADLEY BIRT لکھتے ہیں:

"THE STUDY OF HIS HISTORY EXERCISED FOR HIM AN ABSORBING FASCINATION AND THE RESULT OF HIS RESEARCH WAS A UNIVERSAL HISTORY WRITTEN BY HIM IN PERSIAN ENTITLED JAME-UL-TAWARIKH"[1]

---

[1] TWELVE MEN OF BENGAL (3rd EDITION) CALCUTTA, P. 112

فارسی کے علاوہ وہ اردو اور عربی کے بھی ماہر فن تھے۔

مولوی عبدالغفور نساخ (۱۸۳۴ء - ۱۸۸۹ء) کا نام اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ بنگلہ دیش کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اردو و فارسی کے مسلم الثبوت مایۂ ناز شاعر اور نثار نے یہاں کے ضلع فرید پور میں جنم لیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا شاہکار 'تذکرۂ سخن شعرا' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے پہلی بار بنگال کے گمنام شعرا کو اردو ادب میں روشناس کرایا۔ اس طرح بنگال کی اردو تاریخ سے متعلق مورخین اور محققین نے جو بے التفاتی برتی تھی، اسے اپنی جنبش قلم سے بڑی حد تک پورا کیا۔ مرزا غالب سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اپنے ایک خط میں مرزا غالب نے ان کی اردو دانی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں 'دانائے رموز اردو زبان اور سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان' سے مخاطب کیا۔ ان کے شاگردوں کا لامتناہی سلسلہ سارے بنگال میں پھیلا ہوا تھا۔ ڈپٹی کلکٹر کے اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے انہوں نے بنگال کے ہر ضلع میں قیام کیا تھا اور جہاں بھی پہنچے اپنی خوبیوں سے وہاں شعر و سخن کی محفل جمع کر دی۔ اردو میں ان کے تین[۳] دیوان کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال عظیم نے ان کی تصانیف کی تعداد سولہ[۱۶] بتائی ہے[۱]۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات کے مخطوطے کی ایک کاپی ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتبخانے میں محفوظ ہے۔ چھپن[۵۶] سال کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے کلام میں شوخی ملاحظہ ہو:

نہ بولو منہ سے مگر آنکھ سے سلام تو لو   تم اپنے چشم سخن گو سے کوئی کام تو لو

ابوالقاسم محمد شمس کلکتوی، عزت مآب نساخ کے فرزند عزیز تھے۔ انکی اردو غزل گوئی

۱؎ مشرقی بنگال میں اردو، ص ۵۸۔

کی دھوم سارے بنگالے میں مچی ہوئی تھی۔ انہیں داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ داغ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ تحت اللفظ کے پڑھنے کے فن میں وہ ماہر تھے۔ انکا بہت سا کلام ضایع ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کے شاگرد عزیز 'طوطی بنگال' علامہ رضا علی وحشت نے ان کے فراہم شدہ کلام کی تدوین کر کے ۱۹۱۹ء میں شایع کیا تھا۔ انکے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

شکل وہ شکل کہ تصویر کو بھی سکتہ ہو   حسن وہ حسن کہ رہ جایئے حیراں ہو کر

فکر دشمن میں وہ آنکلے ادھر   مفت کا احسان میرے سر رہا

اب وہ کیا آئیں گے ملنا انہیں منظور نہیں   رات کی آس گئی صبح بھی کچھ دور نہیں

غالب کے ایک شعر سے انہوں نے ایک نیا مضمون اخذ کیا:

غالب: واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

شمس کلکتوی: میں جس کو پی رہا ہوں وہ حاضر ہے واعظو   تم جسکو کہہ رہے ہو وہ کیسی شراب ہے[۱]

مولوی عبدالباری حیدر، نساخ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ بھی اردو و فارسی میں شاعری کرتے تھے۔

مولوی حفیظ الدین شہید، نساخ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اردو و فارسی دونوں میں شعر لکھتے تھے۔ کلکتے میں غالب سے ایک مشاعرے میں ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کے فی البدیہہ اشعار سن کر غالب بھی متاثر ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں انتقال ہوا۔

مولوی محمد فاضل فرید پور کے باشندے تھے، مگر ساری زندگی انھوں نے باریسال میں گزاری۔ 'کنز السعادت' ان کے اخلاقی اشعار کا مجموعہ کا نمونہ سے

۱؎ ماہنامہ 'خاور'، ڈھاکہ، بابت اپریل ۱۹۵۲ء۔

شائع ہوا تھا۔

مولوی عبدالجبار مشہور واعظ تھے۔ اردو کے علاوہ انھوں نے بنگلا زبان میں کئی دینی کتابیں تصنیف کیں۔ 'تزکیۃ النسا' اور 'نصاب المسائل' ان سے یادگار رہیں۔

مولوی سراج الدین سراؔج کے دیوان کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔

میمن سنگھ: میمن سنگھ کے ایک چھوٹے موضع بولائی میں اردو کے چراغ کو مولانا عبدالحئی اختر نے روشنی دی۔ وہ ایک جید عالم اور فقیہ تھے۔ ۱۸۴۱ء میں اسی موضع میں ان کی پیدائش ہوئی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ یوں تو ان کی تصانیف کی تعداد پچپن ۵۵ کے قریب ہے۔ لیکن ان میں کثیر تصانیف فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ 'کلمۃ الحق' ایک اردو رسالہ ان سے منسوب ہے۔ انھوں نے مولانا کرامت علی جونپوری سے فیض حاصل کیا تھا۔ انکا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

انہیں کے با افتخار بیٹے خالد بنگالی تھے۔ خالد بنگالی کا اصل نام محمود الرب صدیقی[۱] تھا، مگر ادبی دنیا میں وہ خالد بنگالی کے نام سے مشہور رہیں۔ خالد کا شمار ان شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھیں نظم و نثر دونوں میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ نثر میں انکا قلم سحر نگاری کا نادر نمونہ تھا۔ رسالہ 'نقاد' آگرہ سے ان کے ایک مضمون 'چاندار موتی' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تیرے نرم ہاتھ، ساعد سیمیں اور نازک انگلیاں جن حرکاتِ لطیف کی مشاق ہیں، وہ یوں ہی ایک دنیا کو سلا دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہ رقص کی معراج کمال ہے کہ

۱؎ ماہنامہ 'خاور' ڈھاکہ، بابت دسمبر ۱۹۵۲ء۔

تجھے خراماں دیکھ کر کائنات رقص کرتی معلوم ہوتی ہے۔"[۱]

اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے وطن بولائی سے ان کی یاد میں ایک رسالہ 'اختر'[۲] نکالا۔ جو بنگلادیش کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انہیں بنگلا زبان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کئی نعتیں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ ان کی معرکۃ الآرا نظموں میں 'گلِ زمیں ڈھاکا'، 'بنگالے کی برسات'، 'جذبات حاضر'، 'عید مبارک'، 'تصویر دیکھ کر'، 'پہلی جھلک'، 'شہادتِ منصوری'، اور 'نوائے سروش' لاجواب ہیں، ان کے مضامین اور کلامِ شاعری اس وقت کے مقتدر رسالوں میں شایع ہوتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے زاہد صدیقی بنگلادیش بننے کے بعد ریڈیو ڈھاکہ کی اردو نشریات میں کافی عرصے تک کام کرتے رہے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

میمن سنگھ کی تیسری اردو داں شخصیت منشی مولوی سید نجم الدین حسین نادرؔ کی ہے۔ یہ کافی عرصہ ہندوستان میں رہے۔ عبدالغفور نساخ کی کتاب 'دفتر بے مثال' کی تقریظ انھوں نے لکھی تھی۔

منشی عظیم الدین خلف منشی برہان اللہ نے اردو میں 'رسالۂ عظیم الدین حنفی' نامی کتاب لکھی۔ اس رسالے کے شروع میں پانچ صفحے کی ایک مثنوی ہے اور آخر میں کچھ خطبے ہیں۔ یہ رسالہ کلکتے سے ۱۳۱۲ھ میں شایع ہوا۔

۱؎ ماہنامہ 'خاور'، ڈھاکہ، بابت دسمبر ۱۹۵۲ء، ص۔ ۳۰ ۲؎ اس رسالے کی تفصیل اگلے باب 'ڈاکٹر شادانی، بہ حیثیت مدیر' میں آئے گی۔

بچوں کے تہذیب الاخلاق کے لیے مولوی ابو ناظم محمد کاظم نے 'تہذیب الاطفال'
ایک مثنوی تحریر فرمائی۔ اس کی زبان بڑی صاف سادہ اور رواں تھی بتیس (۳۲) صفحات پر
مشتمل یہ مثنوی بریلی سے ۱۳۲۸ھ میں شایع ہوئی۔

حاجی صوفی میاں نے 'میزان معین' کتاب لکھی، جس میں اسلامی احکام کے فضائل
کو بیان کیا گیا ہے۔ بنگلادیش کے سب سے پہلے عربی اور فارسی کے مطبع کرڈئیہ ہمین سنگھ
میں یہ کتاب چھپی۔

مولوی نوازش علی نے درسی کتاب 'مختصر جغرافیہ' تالیف کی۔ اس کا حجم اٹھاون صفحات
ہے۔ کلکتے کے اسلامیہ پریس میں ۱۹۱۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے
سرکاری مدارس میں شامل نصاب تھی۔

شیخ محمد نذیر اٹھارہویں صدی میں کنور گنج میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک
مثنوی 'بدیا سندر' اردو میں تحریر فرمائی۔ میر حسن دہلوی کی گلزار نسیم سے متاثر ہو کر
انھوں نے یہ مثنوی لکھی تھی[1]

نواکھالی: نواکھالی کے باشندے شاہ خلیل الرحمٰن نندن پوری نے فارسی
اور عربی کے علاوہ اردو زبان میں شاعری کی ہے۔ ان کا ایک دیوان 'نوشۂ خلیل' اردو،
فارسی اور عربی نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل تھا، جو کانپور سے شایع ہوا۔ اس کے علاوہ
انھوں نے اپنے بغداد کے سفر کا حال 'سفرنامۂ خلیلی' میں درج کیا ہے۔ ساٹھ (۶۰) صفحات
کی یہ کتاب کانپور سے ہی ۱۳۳۱ھ میں چھپی۔

نواکھالی کے دیگر اردو دانوں میں مولوی تبارک علی نے 'حسام الذاکرین' تالیف

[1] حکیم حبیب الرحمٰن، ثلاثہ غسالہ، غیر مطبوعہ، ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ۔

کی۔ اس کی تالیف میں انھوں نے ۴۵ کتابوں سے استفادہ کیا۔

قاری محمد نور اللہ نے دیوبند سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی کتاب 'انوار التصدیع' دہلی
سے ۱۳۵۶ھ میں شایع ہوئی۔

مولوی عبدالسبحان نواکھالی مدرسے کے مدرس تھے۔ انھوں نے 'دیوان علی' کی
شرح لکھی اور اس کا نام 'حل دیوان علی' رکھا۔ اس کا حجم ۵۲ صفحات ہے اور یہ
نواکھالی سے ہی شایع ہوئی۔

مولانا محمد حامد نے کئی دینی رسالے تالیف کیے۔

مولوی عبدالمجید فاضل دیوبند تھے اور مدرسۂ اسلامیہ ڈھاکہ کے ناظم رہ چکے تھے۔
انھوں نے 'مسائل اصول فقہ' اور 'تردید الخطبہ' کتابیں لکھیں۔

کمیلا: بنگلادیش کے شہر کمرلا جسے کمیلا بھی کہا جاتا ہے، چند اساتذۂ اردو موجود
تھے۔ ان میں مولوی فریدالدین احمد نے فارسی میں لکھے ہوئے گورنمنٹ ایکٹ ہشتم کا اردو
میں ترجمہ کیا جو ۱۸۵۹ء میں شایع ہوا۔

منشی عبدالحق لطیف نے اپنی زندگی ایک مدت تک لکھنؤ میں گزاری۔ ناسخ
کے دوستوں میں تھے۔ اردو میں شاعری کرتے تھے۔

چودھری سید محمد اسمٰعیل رحمٰن اعجازی نے ظرافت کے ذریعے اسلامی تعلیم دی۔ انکی کتاب
'گلزار ظرافت وسعادت' مزاحیہ قصوں سے پُر ہے۔ یہ کتاب بریلی سے شایع ہوئی۔

ان اضلاع کے علاوہ بنگلادیش کے دوسرے ضلعوں رنگ پور، پبنہ، باریسال،
جیسور اور راجشاہی میں بھی چند قابل ذکر ہستیوں نے اردو ادب میں چند کتابیں تالیف
کی ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بنگلادیش کا ہر ضلع کم و بیش اردو زبان و ادب سے
وابستہ رہا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب اسلام آباد

۶۷ ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد۔ پاکستان

۹ر دسمبر ۹۳ء

حضرت مکرم اصلاحی صاحب زیدعزہ۔ سلام مسنون

راقم السطور کا ایک مضمون بعنوان "گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف محمد بن جلال شاہی رضوی" معارف بابت مئی ۱۹۹۳ء میں شایع ہوا تھا۔ مضمون کی سرخی میں لفظ "گمنام" اور نفسِ مضمون کے جملے "محمد بن جلال شاہی رضوی ہندوستانی مصنف ہیں، ان کی چند فارسی تصانیف دستیاب ہیں مگر خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے" (ص ۳۳۹) نے وسیع اور دقیق مطالعہ رکھنے والے اہلِ علم کی توجہ حاصل کی۔ احمد آباد سے محترم ضیاء الدین دیسائی نے راقم السطور کے نام پُر از معلومات مکتوب (محررہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۹۳ء) بھیجا اور مصنف کے بارے میں متقدمین کی نگارشات اور تحقیقات کے حوالے فراہم کیے۔ جناب خضر نوشاہی نے بھی میرے مضمون کی تکمیل کے طور پر ایک مقالہ "روضات شاہی اور اس کا مصنف" معارف، اکتوبر ۱۹۹۳ء میں چھپوایا۔ خضر صاحب کا مقالہ تو قارئین پڑھ چکے، یہاں جناب ڈیسائی کا خط نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ دیگر قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔

"معارف والے مضمون کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ صاحب گمنام نہیں بلکہ مشہور و

معروف ہستی ہیں جن کا ذکر جہانگیر کی توزک اور شاہجہاں کی تاریخوں اور شعرا کے کچھ تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ سید محمد المعروف بہ مقبول عالم آپ کے ہاں (پاکستان) اُچہ کے مشہور و معروف صاحبِ ولایت مخدوم جہانیاں جہانگشت سید جلال الدین بن حسین بخاری کے پوتے (جو اُچہ سے گجرات آئے) سید برہان الدین محمد قطب عالم کے صاحبزادے سید سراج الدین محمد شاہ عالم کے پڑپوتے اور ان کے صاحب سجادہ تھے۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ صاحبِ علم و ورع تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے جس کا ایک نسخہ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے ذخیرے میں، ایک یہاں کتب خانۂ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ [احمد آباد] میں اور ایک لاہور دانشگاہ [پنجاب] لائبریری میں [ڈاکٹر سید عبد اللہ کی فہرست مخطوطات فارسی کے مطابق] موجود ہے۔ یہ لکھتے وقت آپ کا مضمون پیشِ نظر نہیں ہے۔ ان کی ایک کتاب جس کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ "الاسولہ والاجوبہ" کے نام سے لندن انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے۔ (ایتھے کی فہرست سامنے نہیں ہے) جہاں غالباً ان کی ایک اور کتاب رسالۂ سلطان محمد شاہی کا (معاد اور اس سے متعلق موضوعات پر) بھی ذکر کیا ہے۔

H-ETHE, CAT, OF, P.MSS. IN THE LIB. OF THE "INDIA OFFICE

VOL. I. COL. 1584 NO. 2916

نیز ان پر ایک مفصل مضمون جلالی احمد آبادی کے عنوان سے بمبئی کے نوائے ادب میں چار قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے لگ بھگ ان کے صاحبزادے سید جلال الدین مقصود عالم المتخلص بہ رضا شاہجہان کے صدر الصدور تھے اور ان کے فارسی دیوان کے دو نسخے موجود ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ان پر (اور اس خاندان پر مختصراً) اپنے

ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم میموریل لکچر دہلی میں لکچر دیا ہے جو کتابچے کی صورت میں شایع بھی ہوا ہے۔ سید جلال کے صاحبزادے سید جعفر بدر عالم نے شاہجہاں کی ان کے والد کے انتقال کے بعد صدر الصدور بنانے کی درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے سجادہ نشینی کو غنیمت سمجھا۔ یہ بھی شاعر تھے۔ صفا تخلص تھا۔ متفرق اشعار ملتے ہیں۔ لیکن دیوان کا پتہ نہیں۔ مرآۃ احمدی کے خاتمہ میں اس خاندان کا ذکر موجود ہے۔ اُچہ وغیرہ میں گجرات کے وہاں کے خاندان کی اس شاخ کے بارے میں مواد ضرور ہوگا۔ ایک فارسی کتاب کہیں نظر سے گزری تھی اس قسم کی لیکن اب تفصیلات ذہن میں نہیں ہیں۔ سید جعفر بدر عالم نے کئی مرتبہ اُچہ کا سفر بھی کیا تھا۔"

احقر راقم السطور مخدومی ڈیسائی صاحب اور جناب نوشاہی صاحب کا ممنون ہے کہ انھوں نے عالمانہ معلومات فراہم کیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہند و پاکستان کی کسی جامعہ کے شعبۂ فارسی کا کوئی طالب علم محمد بن جلال شاہی رضوی کے خاندان کی علمی خدمات پر کوئی امتحانی مقالہ ایم۔ اے یا پی۔ ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے لکھے۔

والسلام۔ عارف نوشاہی

مکتوب شکاگو

شکاگو (امریکہ)

۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء

محترمی اصلاحی صاحب! سلام و تحیۂ مسنونہ۔ خدا کا شکر ہے کہ معارف کے تین پرچے (جون، جولائی اور اکتوبر) ایک ساتھ ملے۔ اکتوبر کے شمارہ میں علامہ شبلیؒ کے شعر فہمی کے مضمون کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ علامہ شبلیؒ کی شعر فہمی تو ایک مسلمہ حقیقت ہے

مگر مضمون میں آپ کے ذوق شعر و ادب کی جو عکاسی ہوئی ہے وہ ہر سطر میں نمایاں ہے مضمون ہر طرح قابل استفادہ ہے۔ اس کے صفحہ ۲۵۰ کے آخر میں جو شعر[1] درج ہے اس کا پہلا مصرعہ ہم نے یوں سُنا ہے:۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

میری رائے میں یہ مصرعہ مصرعۂ ثانی کی مناسبت سے بلیغ تر ہے۔ اس بارہ میں آپ کی رائے مطلوب ہے[2]

کیفی اعظمی کی کتاب کے سلسلہ میں آپ کے دیے ہوئے پتوں کا شکریہ۔ ہندوستانی پتہ سے انشاء اللہ کتاب حاصل کی جائے گی۔ والد محترم کی صحت کے بارہ میں آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ انکے لیے دعا گو ہوں۔ امید کہ آپ مع متعلقین بہ خیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص۔ سعید صدیقی۔

مکتوب کلکتہ

انڈو عرب کلچرل ایسوالیشن۔ کلکتہ

مورخہ ۴ اپریل ۹۳ء[3]

مکرمی جناب ضیاء الدین صاحب اصلاحی، سلام مسنون۔

سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرا مقالہ اپنے مؤقر رسالہ

---

[1] پورا شعر یوں ہے: ز غارت چمنت بر بہار منت ہاست ؛ کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند (معارف)

[2] فارسی زبان کے علماء و فضلا اگر اس پر اظہار خیال فرمائیں تو معارف کے صفحات میں اسے شایع کیا جائیگا۔ (معارف)

[3] یہ خط پہلے آیا تھا اور کھو گیا تھا، اس کی اہمیت اور مقالہ نگار کے اصرار کی وجہ سے شایع کیا جاتا ہے، تاخیر کے لیے معذرت پیش کی جاتی ہے (معارف)

'معارف' برائے مارچ ۱۹۹۳ء میں شایع کر دیا۔ آپ کے ادارے نے اس کے پروف کی تصحیح محنت سے کی ہے یعنی اس میں طباعت کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں میں مندرجۂ ذیل باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

میرے مقالے کا اصل عنوان تھا "ہندوستان میں اسلامی مخطوطات" جسے بدل کر آپ نے "خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم مخطوطات" کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس مقالے کا عنوان "اسلامی خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم اسلامی مخطوطات" ہونا چاہیے تھا۔

ص ۲۰۳ کے فٹ نوٹ میں آپ نے لکھا ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں بھی نادر مخطوطات ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے آپ کی شبلی اکیڈمی کے اسلامی مخطوطات کی کوئی فہرست اب تک شایع نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے اسلامی مخطوطات کی ایک فہرست شایع کریں یا کم از کم جو نوادرات آپ کے یہاں موجود ہیں ان کا تفصیلی ذکر 'معارف' ہی میں بالاقساط شایع کریں[1]۔

اس نوٹ میں آپ نے لکھا ہے کہ مقالہ نگار کا انتخاب کلکتہ اور پٹنہ تک ہی محدود ہے۔ آپ کے نوادرات کا مجھے علم نہیں ہے ورنہ میں اپنے مقالے میں ایک دو مخطوطات کا ذکر ضرور کرتا۔

یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ مذکور میری ایک انگریزی تقریر کا اردو ترجمہ ہے، جس میں ہندوستان کے اسلامی مخطوطات کے نوادرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ میں آپ کی اور اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک

[1] معارف، برہان اور آجکل میں مضامین شایع ہو چکے ہیں (معارف)

کتاب ISLAMIC MANUSCRIPT IN INDIA کئی سال کی محنت کے بعد مرتب کی ہے اور وہ انگریزی میں 'الفرقان اسلامی فاؤنڈیشن، لندن' کی طرف سے شایع بھی ہو چکی ہے۔ امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں گے۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص، محمد صابر خاں کان اللہ لہٗ

مکتوب علی گڑھ

حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

۲۷ دسمبر ۹۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ کچھ مدت قبل موصول ہوا تھا۔ اس دوران ضیاء الحسن فاروقی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جواب نہیں ملا۔ وہ اعظم گڈھ میں ہیں یا وہاں سے ان کی مراجعت ہو گئی ہے؟[1]

دسمبر ۱۹۹۳ء کے معارف میں آپ کا اداریہ حسب معمول متوازن اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے بالخصوص یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ مسلمانوں میں "جو لوگ مسجد کا تحفظ نہیں کر سکے انہیں اس کی شہادت کی یادگار اور برسی منانے کا کیا حق ہے۔ آخر ان کی بے تدبیری سے سادہ لوح مسلمانوں کا خون خرابہ کب تک ہوگا"۔ تاہم دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ کیا بابری مسجد کی شہادت کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی ذمہ داری صرف اس قدر تھی کہ اس نے بقول آپ کے "گومگو پالیسی" اختیار کی؟ میرا خیال یہ نہیں ہے اور میرے خیال کو سپریم کورٹ کے دو سابق ججوں اور پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ اور مغربی بنگال ہائی کورٹ کے ایک سابق چیف جسٹس (اور یہ تینوں ہندو ہیں) کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے جو انھوں نے

[1] لکھنؤ تشریف لے گئے (معارف)

حال میں پوری تفتیش و تجسس کے بعد جاری کیا ہے اور جس میں نہایت جرأت، غیر جانبداری اور وضاحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ اس بارے میں مرکزی حکومت کی بے عملی اس بنا پر نہیں تھی کہ اسے یو۔پی کی حکومت نے دھوکے میں رکھا بلکہ اس نے یہ رویہ جان بوجھ کر اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ وہ ہندو ووٹوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ مجھ جیسے مسلمانوں کو، جنھیں اپنی مملکت کے سیکولر کردار پر ناز تھا، صدمہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی معاون جماعتوں کے طرز عمل سے اس لیے نہیں پہنچا ہے کہ ان سے اس کے علاوہ کوئی توقع ہی نہیں تھی بلکہ صدمہ اس مرکزی حکومت کے رویے سے پہنچا ہے۔ جو سیکولرزم کی دعویدار تھی اور آج بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور حزب اختلاف کی سیکولر جماعتوں کا تعلق ہے، وہ تو برابر یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ مرکزی حکومت "سپریم کورٹ سے اپنا ریفرنس زیر دفعہ ۱۴۳ واپس لے کر دستور کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ کو فیصلے کے لیے بھیج دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی کیجائے" لیکن مرکزی حکومت کے کان پر جوں نہیں رینگتی ہے۔ ابھی حال میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی قیادت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا جو وفد وزیر اعظم سے اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے ملا تھا اس کے ساتھ ان کا رویہ اتنا سرد تھا کہ مولانا علی میاں کا یہ بیان اخباروں میں آیا تھا کہ وہ اب سلسلے میں وزیر اعظم سے ملاقات نہیں کریں گے اس لیے میری ناچیز رائے میں یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان مسلمانوں کی ہے (اور ان میں علمائے کرام اور دانشور دونوں ہی طبقوں کے لوگ شامل ہیں) جو اجودھیا کے المیے کے باوجود کانگریس کے خیر خواہ اور حامی ہیں کہ وہ اپنی پسندیدہ مرکزی حکومت

کو کم سے کم اسی تجویز کو ماننے پر آمادہ کر دیں جس کی نشاندہی آپ نے مذکورہ بالا جملوں میں فرمائی ہے اور جن کا حوالہ میں نے دیا ہے۔ امید ہے مزاج گرامی بخریت ہوگا۔

نیازمند۔ ریاض الرحمن شروانی

مکتوب پٹنہ

پھلواری شریف، پٹنہ

۳۰ نومبر ۹۳ء

مکرمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب۔ السلام علیکم

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ خدا کرے۔ میرا ایک مضمون بہ عنوان: "اقبال کے کلام کی قرآنی تلمیحات کے اشاریے" آپ کو موصول ہو چکا ہے جس کے موصول ہونے پر آپ نے ازراہ تحسین اسے موصول ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے "یادگار مقالہ" سے موسوم کیا ہے۔ اس ہمت افزائی کے لیے میں آپ کا خصوصی طور پر اور دار المصنفین کا عمومی طور پر بیحد مشکور ہوں۔

اس مضمون[1] میں میں نے اقبال کے ان اشعار کے اشاریے دیا تھا جن میں اقبال نے قرآن کے عربی متن کے الفاظ یا آیت کے فقروں کو اپنے اشعار میں عربی متن میں استعمال کیا ہے۔ اب جو مضمون[2] بھیج رہا ہوں اس میں اقبال نے اپنے اشعار میں آیات کا ہو بہو منظوم ترجمہ کر دیا ہے اور عام قاری کے لیے اسے پکڑنا کہ یہ کس آیت کی ہو بہو منظوم ترجمانی ہے، مشکل ہے۔ اس لیے ایسے ستر اشعار کے قرآنی آیات کے حوالوں کے ساتھ اشاریے دیے گئے ہیں اور اس مضمون کا اسی لیے نام ہے: "اقبال کے کلام میں قرآنی آیات کے منظوم ترجموں کے اشاریے" کیا کریں پچھلے پچاس برسوں میں لوگوں نے اقبال کو "حکیم الامۃ" کا لقب دیا ہے

---

[1] مضمون اسی شمارہ میں شامل ہے [2] یہ بھی مل گیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ شایع ہوگا۔

اور ان کے نام کے قبل علامہ اور آخر میں رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ مگر اس ستم ظریفی کو کیا کیجیے، کہ مٹھی بھر لوگ جو اقبال کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں وہ اقبال کو ولیؔ سے لے کر حسرتؔ، جگرؔ اور فراقؔ کی صف میں کھڑا کرکے فیتہ لے کر ان کے جسم و جثہ کو ناپتے ہیں۔ کسی نے ان کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ آسان کام نہیں ہے۔

اس ناچیز نے اقبال کی روح کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجہ میں میری آٹھ کتابیں شایع ہوچکی ہیں جن کی فہرست پچھلی بار ہم نے آپ کو بھیجی تھی۔ دعا میرے لیے نہیں کیجیے، بلکہ اس کی کیجیے کہ اقبال کا نورِ بصیرت عام ہو۔

احقر محمد بدیع الزماں

مکتوب لکھنؤ

۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ) لکھنؤ

۲۰ر دسمبر ۹۳ء

جناب مولانا صاحب! سلام مسنون

اس وقت میرے پیشِ نظر "معارف" بابت مئی ۹۳ء کا شمارہ ہے۔ اس میں ص۳۵۵ سے ص۳۶۷ تک جناب جاوید اختر صاحب کا مضمون "رسالہ مخزن لاہور" شایع ہوا۔ فاضل مضمون نگار نے ص۳۵۷ میں لکھا ہے کہ "محسن الملک نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں اسکے (اردو ہندی اختلاف) خلاف احتجاج کیا اور کامیاب جلسے کیے۔ اگست ۱۹۰۰ء میں جب لکھنؤ میں جلسہ منعقد ہوا تو پنجاب کی نمایندگی غلام بھیک نیرنگ، شیخ محمد اقبال اور شیخ عبد القادر نے کی۔۔۔" یہ جملہ "رسالہ مخزن کے اجرا کا سبب" کے تحت درج ہوچکا ہے، جاوید اختر صاحب نے اس عبارت کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ عبارت انکو کہاں سے ملی ہے اور اسکا ماخذ کیا ہے۔ میرے پاس جاوید اختر صاحب کا ایڈرس نہیں ہے۔ براہ نوازش انکا ایڈرس لکھکر ممنون فرمائیے گا[1]۔ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔

والسلام۔ نیازمند۔ اکبر حیدری کشمیری

---

[1] وہ اب کسی عرب ملک میں چلے گئے ہیں، مجھے انکا پتہ معلوم نہیں۔ اگر معارف انکی نظر سے گزرے گا تو ممکن ہے جواب دیں۔

وفیات

ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ

از پروفیسر مختار الدین احمد

دوشنبہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو حافظ غلام مصطفیٰ سابق ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں وفات پاگئے۔ تدفین یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

ان کی ولادت الہ آباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ حفظِ قرآن اور ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے نجی طور پر تعلیم حاصل کرکے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے، آگرہ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں اور علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر عبد العلیم مرحوم کی صدارت کے عہد میں وہ شعبۂ عربی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ انہی کی نگرانی میں عہد جاہلی کی عربی شاعری میں مذہبی رجحانات کے موضوع پر انھوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریڈر مقرر ہوئے اور ۲۵ سال شعبے میں تدریسی فرائض انجام دے کر ۱۹۷۹ء میں متقاعد ہوئے۔

ان کی مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

RELIGIOUS TRENDS IN PRE-ISLAMIC ARBIC POETRY

(مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۸ء)

(۲) ابن الفارض: عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت (علی گڑھ ۱۹۷۳ء)

(۳) اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام مصنفہ الشیخ شہاب الدین احمد بن محمد الاسدی

المکی الشافعی (متوفی ۱۰۶۶ھ) بنارس ۱۹۷۶ء۔

ان کتابوں کے علاوہ انگریزی، عربی اور اردو میں ان کے مضامین متعدد رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔

اولاد میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے یادگار چھوڑے ہیں۔ سب تعلیم یافتہ ہیں اور برسر روزگار۔ صفیہ جاریہ نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: "داستان یوسف زلیخا در شعر فارسی" فارسی زبان و ادب سے متعلق متعدد مقالات برہان، تحریر اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوئے ہیں وہ آج کل شعبۂ فارسی میں ریسرچ ایسوسیٹ ہیں۔ میمونہ جاریہ کیمیا میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کرکے اسی شعبہ میں لکچرر مقرر ہوگئی ہیں، غلام مرسلین نے عربی میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ایم فل کا مقالہ انھوں نے مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی پر لکھا تھا جو کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے۔ علامہ مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کو مرتب کرکے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آج کل ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے شعبے میں لکچرر ہیں۔

حافظ غلام مصطفیٰ مرحوم کے رفیق اور دوست پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبۂ اسلامیات کی توجہ سے ان کی انگریزی اور اردو کتابیں شایع ہوئیں جب کہ عربی کتاب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے اہتمام میں مکتبۂ سلفیہ بنارس سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اگر علی گڑھ کا شعبۂ عربی مرحوم کے مضامین بھی جمع کرکے شایع کردے تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔

مولانا محب اللہ لاری، ندوی

افسوس ہے کہ مولانا محب اللہ ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۳۰ نومبر ۱۹۹۳ء

کو رحلت فرماگئے، انکی عمر ۸۸ برس تھی اور وہ نحیف و کمزور بھی ہوگئے تھے لیکن ندوۃ العلما کے دور کمال کی ایک یادگار تھے اور ان کا وجود ندوۃ العلما خصوصاً اس کے ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے لیے باعث تقویت تھا جن کے مرحوم ہم سبق تھے۔

ان کا وطن لار تھا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ اور انگریزی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی اس کے بعد وہ چاہتے تو اچھی سی اچھی ملازمت مل جاتی مگر انھوں نے فراغت کے بعد کانپور میں اپنی انڈسٹری کرلی۔

کاروبار میں لگ جانے کے بعد بھی انھوں نے ندوۃ العلما اور اس کے فضلا سے اپنا تعلق باقی رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے برابر رکن رہے۔ ۱۹۶۹ء میں بعض خاص حالات کی بنا پر انہیں دار العلوم کے اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو کم و بیش ۲۵ برس تک وہ انجام دیتے رہے اور وفات کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے۔

دینداری، تقویٰ اور خشیت الٰہی ان کا شعار تھا، طبیعت میں اعتدال، سلامت روی سادگی اور انکسار تھا۔ اپنے اخلاص، مروت، شرافت اور حسن خلق کی بنا پر طلبہ، اساتذہ اور منتظمین کے حلقے میں مقبول رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندے کی مغفرت فرمائے۔ آمین

اب مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلما کے اہتمام کی ذمہداری سنبھالی ہے، جن کا انتخاب ان کے طویل تجربہ اور دیرینہ خدمات کی بنا پر بہت مناسب ہوا ہے۔

جناب اسلام احمد

دسمبر کا مہینہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ جناب اسلام احمد ریٹائرڈ آئی۔ جی کے انتقال کی خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ وہ علامہ شبلیؒ مرحوم کے ہم خاندان اور خاص عزیز تھے، ان کے والد بزرگوار شیخ محمد اقبال الٰہ آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، جنکے

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے مخلصانہ روابط تھے۔ اسلام احمد صاحب بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں آئی جی ہوکر ریٹائر ہوئے۔

وہ لکھنؤ میں متوطن ہوگئے تھے لیکن اپنے وطن اعظم گڈھ سے انہیں ہمیشہ بڑا تعلق رہا، ان کی تدفین بھی بندول میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی، یہاں کے لوگوں سے بلا تفریق مذہب و ملت بڑی محبت، خلوص اور گرم جوشی سے ملتے اور ان کی خاطر مدارات میں کمی نہ کرتے۔ ان کی اہلیہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کوئریا پار اعظم گڈھ کے ایک شریف و نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اردو کے مشہور ادیب و نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی ان کے حقیقی بھتیجے تھے، جو اور اس خاندان کے دوسرے اشخاص بھی بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، علمی و دنیاوی وجاہت کی طرح دینداری میں بھی یہ خانوادہ ممتاز تھا۔

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں ہوئی تھی اور انھوں نے الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی اچھے نمبروں سے پاس کیے تھے، ۱۹۲۵ء میں وہ شبلی نیشنل ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

مولوی صاحب کو قومی و ملی اشغال سے بھی سروکار رہا اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے، اعظم گڈھ کے نسواں اسکول کے جواب گریجویٹ کالج ہوگیا ہے بانی ارکان میں تھے، برسوں اس کے صدر بھی رہے۔

ملازمت کے ابتدائی زمانے سے دارالمصنفین آنے کا معمول بنا لیا تھا۔

اس وضع داری کو اس وقت تک نباہا جب تک پیروں میں توت رہی، انہیں مولانا سید سلیمان ندوی صاحبؒ اور مولوی مسعود علی ندوی کی مجلس میں باریاب ہونے کا شرف حاصل تھا، شاہ معین الدین احمد اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان اور دوسرے رفقا اور کارکنوں سے نہایت بے تکلف تھے، اس ناچیز پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔

دو تین برس سے بالکل معذور اور خانہ نشین ہوگئے تھے بالآخر ۲۸ اور ۲۹ دسمبر کی درمیانی شب میں واصل بحق ہوگئے، اللہ ان کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

"ض"

یادِ رفتگاں

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ان ۱۳۵ تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اساتذہ، پیرِ طریقت، احباب، معاصرین اور دوسرے مشاہیر کی رحلت پر سپرد قلم کی تھیں، قلب و قلم کی دردمندی نے ان تحریروں کو ادب و انشا اور تاریخ و سوانح کے شہ پاروں کی حیثیت بخش دی ہے۔ قیمت:- ـــ ۵۰

بزمِ رفتگاں

اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے قلم سے ان کے اکابر و معاصر پر نثری مرثیے ہیں جو پُراثر ہونے کے علاوہ پُراز معلومات بھی ہیں۔

قیمت جلد دوم .. ۳۵

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

نقوش مدیر جناب جاوید طفیل، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت، مصور و مجلد مع گردپوش

صفحات ۲۴۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: نقوش، اردو بازار، لاہور، پاکستان۔

رسالہ نقوش کی شہرت کا سبب اصلاً اس کے خاص نمبر اور سالنامے ہیں، زیرنظر نمبر بھی سالنامہ ہے اور طباعت و ضخامت میں اپنے پیش رو شماروں کا نقش ہے، بلند پایہ علمی و ادبی مقالات و مضامین، سفرناموں اور منتخب افسانوں کے علاوہ حصۂ شعر بھی خاصا ہے اور اس میں بھی حمد و نعت کا حصہ جدا ہے، مقالات میں ڈاکٹر گیان چند جین کی تحریر "اردو زبان کا پس منظر" کے عنوان سے سر مقالہ کی حیثیت سے ہے، اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ "اردو محض کھڑی بولی کا شستہ روپ ہے، اس سے جدا نہیں" اس ضمن میں چند ماہرین لسانیات کی تحقیق کا رد بھی کیا گیا ہے، ان کے نرم و نازک لہجہ میں 'لسانی مالیخولیا'، 'لسانی مجذوبیت' اور 'لسانی شعور کی کمی' جیسی درشت تعبیرات کا احساس بھی ہوتا ہے، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس رائے کہ "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں اس لیے قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا" پر اعتراض کیا ہے کہ "سید صاحبؒ کو اس سے غرض نہیں کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور سندھ کے ہندوؤں کی زبان براچڈا پ بھرنش، ان کے میل سے سندھی زبان بن سکتی تھی اردو نہیں" .... فاضل

مقالہ نگار کی یہ ترجمانی درست نہیں، سید صاحبؒ نے صاف لکھا ہے کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان صرف عربی ہی نہیں فارسی بھی تھی، انھوں نے کئی معاصر شہادتوں کے بعد ثابت کیا ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں واقع ہوا وہ سندھ ہے، پھر سید صاحب اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ "سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں"۔ ایک اور عمدہ مضمون تاریخ اسلامی کے عہد ساز موڑ ہے اس میں ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی نے مکہ میں اسلام کے آغاز میں تبلیغ کے طریقہ کا جائزہ لیا ہے، ایک دلچسپ مضمون فراق کی دانشورانہ حیثیت پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے قلم سے ہے اس میں ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ "فراق کے مزاج نے دوستوں کو دور کیا، مداحوں کو ناراض کیا، خود تمام عمر تکلیف اٹھائی، یہی تخلیقی انسان کی پہچان ہے" ان کے مضمون میں مغضوب الغضب، آرجار، کریانے کی دوکان شاید کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں، دوسرے مضامین میں بھی کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں، ایک اور مضمون میں یگانہ چنگیزی کا وہ کلام یکجا کیا گیا ہے جو ان کے چاروں شعری مجموعوں میں شامل نہیں، ان کے بعض منسوخ اشعار بھی دیدیے گئے ہیں حالانکہ ان کے غیر منسوخ کلام میں ایسے کئی اشعار ہیں جو تنسیخ ہی کے مستحق ہیں، جمال الدین افغانی پر جناب ابوسفیان اصلاحی کا مقالہ مفصل ہے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ٹسکینی سے چین تک" یہاں ٹسکینی کی وضاحت ضروری تھی، لکھنؤ میں اردو گلدستوں کی روایت، مسلم ہسپانیہ کی میراث کے علاوہ شیخ عبدالقادر صاحب مخزن پر مفید اور جامع مضمون ہے یہ گویا شیخ صاحب کے مضامین و تصنیفات کی کتابیات بھی ہے، ایک اور قابل ذکر مضمون "سفر ناتمام غالب کی تلاش میں" ہے، یہ دلچسپ مضمون غالب کے شیدائیوں کے لیے معلومات کے ساتھ بعض نئے موضوعات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جناب شیخ نذیر حسین کے دو مضامین ہیں ایک

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی پر، دوسرے مضمون میں انھوں نے اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار سے فرنگیوں کے متعلق مشاہدات و تجربات کا ترجمہ کیا ہے، آغا بابر کے پرکشش 'خدوخال' کے علاوہ ہندوستان کا سفرنامہ بھارت ۸۸ کے عنوان سے ہے۔
اس عمدہ، متنوع اور جاذب نظر شمارہ کے لیے ادارہ نقوش مبارکباد کے لائق ہے۔

سہ ماہی **فکر و نظر** حالی نمبر مدیر جناب شہریار، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت صفحات ۲۱۶، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ادارہ فکر و نظر علی گڑھ نے علی گڑھ تحریک سے وابستہ نامور اور اہم شخصیات کے کارناموں کو نمایاں کرنے اور ان کے نام نیک کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے خصوصی شمارے شایع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر اور نامورانِ علی گڑھ نمبر اور زیرِ نظر حالی نمبر اسی منصوبہ کی عملی تصویر ہے، مولانا حالی اور سرسید کے تعلقات کے علاوہ فاضل مدیر کو یہ احساس بھی ہے کہ "اردو شعر و ادب میں حالی کے بغیر نہ تو قدیم ادب پر غور کیا جا سکتا ہے، نہ جدید ادب کو سمجھا جا سکتا ہے"۔ یہ پورا خاص نمبر اسی متن کی جامع شرح اور عمدہ بیان ہے، مضامین کو تین حصوں یعنی تنقید، شاعری اور متفرقات میں تقسیم کیا گیا ہے، حصۂ تنقید سے مولانا حالی کے فلسفۂ تنقید کی وضاحت کے علاوہ خود نقادوں کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا دلچسپ مشاہدہ ہوتا ہے، پروفیسر آل احمد سرور کی رائے میں "گذشتہ سو سال میں تنقید میں بہت سی راہیں کھلی ہیں مگر حالی کی شاہراہ .... اردو تنقید کے لیے صراط مستقیم کہی جا سکتی ہے"۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر میں "حالی کے بڑے نقاد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی غلط باتیں کہیں لیکن وہ

سب مقبول اور موثر ثابت ہوئیں"۔ جناب ابوالکلام قاسمی نے لکھا کہ "حالی کی ذہنی نشو و نما اور ادبی تربیت میں عربی کی تنقیدی روایت کا عمل دخل بہت نمایاں ہے بخلاف شبلی کے .... جن کا مزاج فارسی ادب کی روایت سے ہم آہنگ ہے"، حالی کی شاعری پر عمدہ تحریریں ہیں، حصۂ متفرقات میں غالب و سعدی، تعلیم نسواں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے حالی کے تعلق کا بیان ہے، آخر میں 'نقش حالی' کے عنوان سے جناب ضیاء الدین انصاری نے مولانا حالی کی کتابوں اور ان کے متعلق کتب و مضامین کی مفصل کتابیات مرتب کر دی ہے۔

فکر و نظر سرسید نمبر، مدیر جناب شہریار، صفحات ۲۹۶، قیمت ۳۶ روپے۔ پتہ: ایضاً۔

حالی نمبر کی طرح یہ سرسید نمبر بھی رسالہ فکر و نظر کے منصوبہ کی ایک کڑی ہے، اس شمارہ کے مضامین بھی تین حصوں میں ہیں، پہلے حصہ میں سرسید کی مذہبی، تعلیمی، علمی اور عقلی خدمات کا جائزہ ہے، دوسرے میں ان کی اصلاحی کوششوں کا تجزیہ ہے اور آخری حصہ میں ان کی تین اہم کتابوں خطبات احمدیہ، آثار الصنادید اور اسباب بغاوت ہند کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، تحریروں میں ایک نمایاں پہلو غیر جانبداری کا ہے مثلاً پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے لکھا کہ "سرسید نے علم کے تین ماخذ تاریخ، فطرت اور متصوفانہ تجربہ میں صرف فطرت سے کسب فیض پر زور دیا ... احکامات اور معاشرتی مسائل کی حد تک تو سرسید کا طریقہ کار مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن الٰہیات میں نہیں ... وہ کم و بیش ہر مسئلہ کا رشتہ اور ہر بحث کی تان نیچر کے اپنے تصور پر لا کر توڑتے تھے ... روح کے وجود کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ناقابل تشفی ہے، ان کے مباحث کی نوعیت صرف

ہنگامی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید کے نظریۂ تعلیم پر ڈاکٹر ظفر الاسلام نے بجا طور پر ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن کی روشنی میں "دینی مدارس اور علوم سے سرسید یا ان کے قریبی رفقا کے شدید اختلاف کے مفروضہ کو قطعی طور پر رد کیا جاسکتا ہے۔" حالی اور سرسید دونوں کے افکار و احوال سے واقفیت کے لیے ان دونوں شماروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ماہنامہ سب رس، عابد علی خاں نمبر، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن کے مدیر شہیر میر عابد علی خاں موجودہ دور میں ہندوستان کی اردو صحافت کی آبرو تھے، انھوں نے اپنی لیاقت، صلاحیت اور محنت سے سیاست کو حیدرآباد ہی نہیں، ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان کی صحافتی دنیا میں اہم مقام دلایا، وہ اپنے تجربہ کی بنیاد پر اردو صحافت کی رفتار سے مایوس نہیں تھے لیکن انکی نگاہیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور قاضی عبدالغفار جیسے جیّد صحافیوں کے نقوش کی متلاشی تھیں، انھوں نے خود ان ناموروں کی تقلید حتی الامکان کی اور اپنے اخبار کو سنجیدہ، متوازن، باوقار لب و لہجہ کا حامل بنایا اور ساتھ ہی سیاسی شعور کے ساتھ ستھرے علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا، اپنے بے لوث اور بے غرض جذبۂ خدمت کی وجہ سے وہ اردو والوں بلکہ عوام و خواص کے ہر طبقہ میں محبوب بنے رہے، ان کی خدمات کے اعتراف میں حیدرآباد کے ادبی ماہنامہ سب رس نے زیر نظر خاص شمارہ شایع کر کے مختلف اہل قلم کی تاثراتی تحریروں کے ساتھ مرحوم کے چند مفید مضامین اور خطوط کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ (باقی)

(ع۔ص)

مطبوعات جدیدہ

تسہیل کلام اقبال پیام مشرق از جناب احمد جاوید، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، نفیس طباعت، خوبصورت جلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۶، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: اقبال اکاڈمی لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے 'پیام مشرق' کا خاص مدعا ایسے اخلاقی، مذہبی اور ملی حقایق کی تلاش و دریافت ہے جو فرد و قوم کی باطنی تربیت کے محرک و معاون ہوں، اس کے دیباچہ میں علامہ نے لکھا تھا کہ "زندگی اپنے حوالی میں اس وقت تک انقلاب نہیں لا سکتی جب تک خود اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اگر انسانوں کے ضمیر میں کسی نئی دنیا کی دریافت متشکل نہ ہو تو خارج میں اس کے وجود کی تلاش بھی لاحاصل ہے۔" 'پیام مشرق' آج بھی اسی قدر اہم اور ضروری ہے جتنا وہ 'حکیم مشرق' کے عہد میں تھا، لیکن برصغیر میں فارسی زبان کا چلن اب کم ہوگیا ہے، اس کا خسارہ کلام اقبال کے شیدائیوں کے لیے اس لیے بھی شدید ہے کہ وہ نصف سے زیادہ فارسی زبان میں ہے، اقبال اکاڈمی پاکستان نے اس کی تلافی کیلئے زیر نظر کتاب شایع کی ہے اس میں پیام مشرق کے اردو ترجمہ کے علاوہ مشکل الفاظ کی تشریح بھی ہے، ترجمہ میں سلاست و روانی کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است — نہ با ہر کس محبت سازگار است

بروید لالہ با داغ جگر تاب — دل لعل بدخشاں بے شرار است

"ہر آدمی محبت کی دولت نہیں رکھتا، نہ محبت ہر کسی کو موافق آتی ہے" لالہ جگر چمکانے والا داغ لیے اگتا ہے، لعل بدخشاں کے دل میں کوئی شرارہ نہیں ہے"۔ خاص بات یہ ہے کہ ترجمے کے ساتھ اسی صفحہ پر اشعار کی فرہنگ بھی ہے، یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے اشتراک سے شایع ہوئی ہے جس کے ڈاکٹر رضا شعبانی کا فارسی مقدمہ بھی اس کی زینت ہے۔

فارسی قصیدہ نگاری از جناب ڈاکٹر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یو۔ پی۔

فارسی زبان و ادب کے نامور محقق اور اس کتاب کے فاضل مولف نے غالب کی فارسی قصیدہ نگاری کے ضمن میں فارسی قصیدہ نگاری کا بھی غائر مطالعہ کیا اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز یہی ہے جس کے مطالعہ کا خاطر خواہ حق ہندوستانی نقادوں اور محققوں نے ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس صنف سخن کے بارہ میں غلط فہمی پھیلانے کے موجب ہوئے، فاضل مولف نے رودکی، عنصری، فرخی، منوچہری دامغانی، سنائی، مسعود سعد سلمان، خاقانی، انوری، امیر معزی، سعدی اور ملک الشعراء بہار کی قصیدہ گوئی کے جائزہ میں قصیدہ نگاری کے بتدریج زوال میں غزل گوئی کی مقبولیت، علمی انحطاط، زبان کے مزاج کی تبدیلی اور قدردانوں کی کمی جیسے عناصر کی نشاندہی کی ہے، انھوں نے قصیدہ کے خواص کا ذکر کرکے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ اگر فارسی شاعری سے قصائد خارج کر دیے جائیں تو اس کا دامن تہی رہ جائے گا اور قصیدہ گو شعرا کے ذکر کے بغیر ادب فارسی کی تاریخ میں دلکشی بھی نہیں رہے گی، انھوں نے قصیدہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت سوگند نامہ پر بھی خاص

توجہ کی ہے، بحث میں اشعار خاصی تعداد میں نقل کیے گئے ہیں اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قارئین کے لیے شعراء کے دواوین حاصل کرنا مشکل ہے، یہ اشعار مقالہ کو خود کفیل بنا دیتے ہیں۔

رباعی از جناب پروفیسر سید وحید اشرف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۴۴، قیمت ۴۲ روپے، پتہ: وارثی پبلیکیشنز ۲۲-۸-۲۱۳ چھتہ بازار، حیدرآباد، اے پی۔

جناب سید وحید اشرف فارسی زبان و ادبیات کے پروفیسر ہیں، تدریس و تحقیق کے ساتھ اردو و فارسی شعر گوئی کی صلاحیتیں بھی ان کو ودیعت ہوئی ہیں، صنف رباعیات سے ان کو خاص دلچسپی ہے، زیر نظر مجموعہ میں ان کی ۱۱۷ اردو اور ۲۹ فارسی رباعیات ہیں، مذہبیات اور سائنس جیسے موضوعات پر مشاہدہ حق کی گفتگو کے علاوہ ایک حصہ بادہ و ساغر کے لیے بھی خاص ہے اور ان دونوں میں ایک آن ہے مثلاً ایک جانب ان کی یہ نعتیہ رباعی ہے:

ہاں پالیا فردوس کا میں نے زینہ — ہے عشق نبیؐ سے مرا روشن سینہ
دارین میں ملجا ہے مرا نام نبیؐ — نعت نبیؐ اعمال کا ہے گنجینہ

تو دوسری طرف یہ رنگ بھی ہے:

ان ہونٹوں سے مے پائے ہے مستی شباب — گل پائے ہے آتش اور گہر آب و تاب
پاتا ہے ہر اک ان سے بقدر استعداد — نطق و شکر و نشہ و آتش و آب

رباعی گوئی میں وہ اس اعتراف کے ساتھ انیس و حالی کے پیرو ہیں کہ ان کے لہجہ میں آج بھی تازگی ہے اور ان کے مانوس و موثر لہجہ کی موجودگی میں کسی اور نئے طرز کا

تجربہ رباعیوں کی افادیت کو مجروح کرنے والا ہے، ان کے خیال میں رباعی کا روایتی اور قدیم آہنگ آج بھی زمانہ کی تاخت وتاز سے بڑی حد تک محفوظ ہے، شروع میں خود نوشت حالات کے علاوہ ان کے قلم سے رباعی کے فن وتاریخ پر عمدہ مضمون بھی ہے اردو کے ساتھ فارسی رباعیات کی آمیزش نے مجموعہ کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

صدائے منبر حصہ دوم از جناب مولانا ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۶۳، قیمت درج نہیں، پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام، عمرآباد، ضلع نارتھ آرکاٹ، تامل ناڈو۔

زیر نظر کتاب ۸ قرآنی مضامین پر مشتمل ہے، اصلاً تو یہ جمعہ کے خطبات تھے لیکن بعد میں یہ مقالات کی شکل میں مختلف رسائل میں شایع ہوئے اور پھر افادۂ عام کی خاطر ان کو کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا، پہلا حصہ قریباً دس برس پہلے شایع ہوا تھا، اس دوسرے حصہ میں شہادت اور گواہی، مثالی نوجوان، قانون خلافت ارضی، تصور عہد و میثاق جیسے اہم قرآنی موضوعات کی تشریح و بیان کے علاوہ قرآن حکیم اور مساکین، علم، اسلام اور مسلمان اور بیع و شراء کے استعارہ کی تفسیر و ترجمانی بڑے پُر اثر انداز میں کی گئی ہے، فاضل مولف کی تحریروں میں مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے اسلوب خاص کا عکس صاف جھلکتا ہے، اب علوم قرآن کی خدمت میں جمال ماجدی کی اثر انگیزی کا مشاہدہ بھی ہو کر رہا۔

ع۔ ص۔

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

حصۂ اول (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے ذاتی حالات وفضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے۔ ۴۵/-

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے حالات وفضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں ان کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعۂ کربلا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو فتح مکہ کے بعد شرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/-

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات اور عام صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابہؓ اول) عبد السلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابہؓ دوم) عبد السلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبد السلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور